پاکستان میں حجیتِ حدیث پر عقلی اور نقلی دلائل سے مزین اولین تحریر

انوارِ حدیث

مصنف

علامہ سید محمد ہاشم فاضل شمسیؒ

(پیدائش ۱۹۱۳ء۔ وفات ۱۹۸۸ء)

مقدمہ

ڈاکٹر سید حامد حسن بلگرامی

سابق وائس چانسلر جامعہ اسلامیہ بہاولپور

تحقیق و تقدیم

ڈاکٹر حامد علی

(ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی)

ورلڈ ویو پبلشرز

لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ ○ [النحل ۱۶: (۴۴)]

پاکستان میں حجیتِ حدیث پر عقلی اور نقلی دلائل سے مزین اوّلین تحریر

انوارِ حدیث

مصنف

علامہ سید محمد ہاشم فاضل شمسی رحمۃ اللہ علیہ

(پیدائش ۱۹۱۴ء۔ وفات ۱۹۸۸ء)

مقدمہ

ڈاکٹر سید حامد حسن بلگرامی رحمۃ اللہ علیہ

(سابق وائس چانسلر جامعہ اسلامیہ، بہاول پور)

تحقیق و تقدیم

ڈاکٹر حامد علی

(ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی)

نام کتاب : انوارِ حدیث

مصنف : علامہ سید محمد ہاشم فاضل شمسی رحمۃ اللہ علیہ

مقدمہ : ڈاکٹر سید حامد حسن بلگرامی رحمۃ اللہ علیہ

تحقیق وتقدیم : ڈاکٹر حامد علی

طبعِ ثالث : جمادی الاولیٰ، ۱۴۴۲ھ / جنوری، ۲۰۲۱ء

تعداد: :

صفحات: : ۲۳۰

ناشر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

انتساب

اردن کے علاقے کرک میں آرام فرما "شہدائے غزوۂ موتہ رضی اللہ عنہم" کے نام،
جن کی آرام گاہوں سے آج ۱۴۳۴ سال گزرنے کے بعد بھی
جان وروح کو فرحت بخشنے والی تازہ خوشبو محسوس کی جاتی ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَلَا تُحْرِمْنَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ
عَنْ زِيَارَةِ وَجْهِكَ الْكَرِيْمِ بِجَاهِ الرَّءُوْفِ الرَّحِيْمِ
عَلَيْهِ أَفْضَلُ الصَّلَوَاتِ وَالتَّسْلِيْم آمين.

<u>نگاہِ کرم کا طالب</u>

ڈاکٹر حامد علی

hamidali41@gmail.com

00923212937062

۞ ..... ۞ ..... ۞ ..... ۞

فہرستِ مضامین

مقدمۂ محقق

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

أَصَحُّ الحَدِيْثِ ثَنَاؤُكَ وَأَصْدَقُ الرُّوَاةِ أَنْبِيَآؤُكَ عَلَيْهِمُ الصَّلَاةُ بِلَا نِهَايَة

وَالتَّحِيَّةُ وَالسَّلَامُ بِلَا غَايَة سِيَّمَا عَلَى أَفْضَلِهِمْ وَأَقْرَبِهِمْ إِلَيْكَ[1]

وَآلِهِ وَصَحْبِهِ الْمَكَرَّمِيْنَ لَدَيْكَ[2].

أَمَّا بَعْدُ

'تحقیق و تنقید' کے لبادے میں دین اسلام پر 'حرف زنی' کی روایت کوئی نئی بات نہیں ہے، مخالفینِ اسلام کبھی خود اور کبھی اپنے 'بکاؤ مال' کے ذریعے یہ کام کرتے اور کراتے آئے ہیں، جس کا مقصد اہلِ ایمان کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کر کے انھیں دینِ اسلام سے برگزشتہ کرنا ہوتا ہے۔ برِ صغیر میں فرنگیوں کی آمد کے بعد اس کام نے زور پکڑا اور یہاں کی مختلف زبانوں میں دین اسلام پر حملوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ بد قسمتی سے 'حسنِ اتفاق' دیکھیے کہ انھیں یہاں مسلمانوں کی صفوں میں 'ایک کھیپ' دستیاب ہو گئی، جنھوں نے جانے انجانے میں معمولی دنیاوی مال کے بدلے آخرت کو بیچ ڈالا۔ چنانچہ

اولاً قرآن کریم کے تراجم اور اُن کی تفسیروں کے ذریعے یہ کام کیا گیا، جن میں ذاتی رائے زنی کے تحت تفسیرِ ماثور کو یکسر نظر انداز کیا جانے لگا،

---

[1] وهو سيّدنا وحبيبنا محمّد رسول الله خاتم النبيين صلى الله عليه وآله وصحبه وسلم.

[2] علامہ عبد العزیز پرہاروی، 'کوثر النبی وزلال حوضہ الروی'، مخطوط، لوحہ ۲۔

ثانیاً سیدِ دوعالم خاتم النبیین ﷺ کی عزت وناموس پر حملے کیے جانے لگے اور آپ ﷺ کے معجزات کو سائنس کے موہومہ قوانین کے زیرِ اثر جھٹلایا جانے لگا، اور **ثالثاً** عقیدۂ ختمِ نبوت کو معاذ اللہ باطل ٹھہرانے کے لیے 'جھوٹے مدعیانِ نبوت' کی کاشت کی جانے لگی۔ بہت سے سادہ لوح لوگ بلکہ بعض اہلِ علم بھی ان باطل پرستوں کے دامِ تزویر میں آ گئے۔

مسلمانانِ برصغیر کے لیے گویا نئے محاذِ جنگ کھول دیے گئے اور شمشیر وسناں کے بجائے، تحریری میدان میں طبلِ جنگ بجا دیا گیا۔ اہلِ ایمان نے ان تمام محاذوں پر بڑی جواں مردی سے مقابلہ کیا، تمام اعتراضات اور شکوک وشبہات کا وافی وکافی جواب دیا، بھٹکی ہوئی عوام کو ہدایت کا روشن رستہ دکھایا اور آنے والوں کے لیے ان نئے محاذوں پر لڑنے کے لیے بہت سا علمی وعقلی سامانِ حرب بصورت کُتب مہیا کیا، اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنی شایانِ شان اجرِ عظیم عطا فرمائے، آمین۔

اِنکارِ حدیث، ایک نیا محاذ

انکارِ حدیث دو قسم کا ہے، ا۔ مطلقاً حدیث کا انکار، یہ صریح کفر ہے۔ اور ۲۔ صراحتاً انکار کے بجائے شکوک وشبہات اور من مانی تاویلات کے ذریعے انکار کا راستہ ہموار کرنا، یہ نہایت خطرناک اور منجر اِلی الکفر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی حفظ وامان میں رکھے۔۔۔ آمین!

مسلمانوں نے ابتدائی بارہ سو سالہ دور تک 'قرآن وسُنت (یا حدیث)' کو دینی احکام کی اساس وماخذ تسلیم کیا، انھیں تسلیم کرنے میں مختلف گمراہ فرقوں کا بھی باہم کوئی اختلاف نہیں تھا۔ یہ جو تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ گنتی کے چند افراد نے اس بارے میں اختلاف کیا تھا، تو یاد رہے کہ اُسی وقت علمائے اسلام کی جانب سے دلائل وبراہین کے ساتھ

ان کے نظریات کی بیخ کنی کر دی گئی تھی، جس کے بعد دوسری صدی ہجری میں یہ فتنہ مکمل طور پر ختم ہو گیا تھا۔ لیکن جیسے ہی تیرہویں صدی کے ابتدائی سال گزرے، رسول کریم خاتم النبیینﷺ کی ایک اور غیبی خبر پوری ہوئی، جس میں آپﷺ نے فرمایا ہے:

«يُوشِكُ رَجُلٌ مِنْكُمْ مُتَّكِئًا عَلَى أَرِيكَتِهِ يُحَدَّثُ بِحَدِيثٍ مِنْ عَنِّيْ، فَيَقُولُ: بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ كِتَابُ اللهِ فَمَا وَجَدْنَا فِيهِ مِنْ حَلَالٍ اسْتَحْلَلْنَاهُ، وَمَا وَجَدْنَا فِيهِ مِنْ حَرَامٍ حَرَّمْنَاهُ، أَلَا! وَإِنَّ مَا حَرَّمَ رَسُولُ اللهِ مِثْلُ الَّذِيْ حَرَّمَ اللهُ أَلَا! إِنِّي أُوتِيتُ الْكِتَابَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ»[3]۔

ترجمہ: ”مستقبل میں ایک شخص تمھارے درمیان اپنی مسند پر ٹیک لگائے ہوئے ہماری حدیثوں کا ذکر کرے گا اور پھر کہے گا: لوگو! ہمارے اور تمھارے درمیان اللہ کی کتاب (قرآن مجید) موجود ہے، اس میں جو کچھ ہم حلال پائیں حلال قرار دیں اور جو کچھ حرام پائیں حرام قرار دیں“، (پھر آپﷺ نے فرمایا:) ”آگاہ ہو جاؤ! اللہ کے رسول نے جو چیزیں حرام قرار دی ہیں، وہ بھی اسی طرح حرام ہیں، جو چیزیں اللہ نے حرام فرمائی ہیں، خبر دار ہو! بے شک مجھے قرآن ملا اور اس کے ساتھ اسی جیسی اور دوسری چیز بھی“۔

گویا ’فرقۂ اہلِ قرآن‘ یا دوسرے لفظوں میں ’انکارِ حدیث‘ کا ایک منظم نیا محاذ سامنے آیا، جو اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ اگرچہ علمائے کرام نے حدیث کی تاریخ اور حجیت پر بہت سے دلائل اپنی کُتب میں تحریر کر دیے تھے، تاہم انھیں ’انکارِ حدیث‘ کے

---

[3] ملاحظہ ہو: ’سنن ابن ماجہ‘، ج۱، ص۶، رقم: ۱۲، و’سنن ابو داود‘، ج۴، ص۲۰۰، رقم: ۴۶۰۴، و’سنن الترمذی‘، ج۵، ص۳۷، رقم: ۲۶۶۳، و’سنن الدارمی‘، ج۱، ص۴۷۶، رقم: ۶۰۶۔

مستقل ایسے کسی محاذ کا سامنا نہیں ہوا تھا، جو تیرہویں صدی میں حدیث کے بمصداق نمودار ہوا۔ پھر چودھویں صدی ہجری میں سارازور اس بات پر لگایا گیا کہ 'تحقیق و تفتیش' کی رو سے حدیث کسی صورت دین کا حصہ نہیں ہے، اسے حقیقتِ ثابتہ یا مسلمہ سمجھنا غلط ہے، اس کا باقاعدہ آغاز تقسیمِ ہند سے پہلے ۱۹۳۸ء میں لاہور سے ہوا، جو تا حال کسی نہ کسی صورت میں تادمِ تحریر (دسمبر، ۲۰۲۰ء) اپنا وجود رکھتا ہے۔ مستشرقین کا انداز اختیار کرتے ہوئے اس محاذ میں بظاہر معروضی طریقۂ کار اپنایا گیا ہے، لیکن بنظرِ غائر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے نتیجۂ تحقیق نکالا گیا ہے اور پھر حاطبِ لیل کی طرح اس 'نتیجے' کے لیے جو کچھ رطب و یابس ہاتھ آیا، اُسے اپنی جانب سے عقلی و نقلی دلائل کا لبادہ اوڑھا کر پیش کر دیا گیا ہے، جو چاہے اس امر کو بخوبی ملاحظہ کر سکتا ہے۔

استشراقی روش

مستشرقین جب قرآن حکیم کو حضور ﷺ کا کلام کہتے تھے، تو وہ مجبور تھے کہ احادیث طیبہ کے متعلق کوئی اور مفروضہ تراشیں۔ یہ بات اُنھیں مناسب معلوم نہیں ہوتی تھی کہ قرآن حکیم اور احادیث طیبہ دونوں کو حضور ﷺ کا کلام قرار دیں۔ مستشرقین کے تخیل کی پرواز ویسے ہی بہت بلند ہوتی ہے، اس لیے انھوں نے احادیث طیبہ کے مصادر تلاش کرنے کے لیے بھی اپنے تخیل کے گھوڑے دوڑائے اور ایک نہیں بلکہ احادیث طیبہ کے کئی مصادر تلاش کر لیے۔ انھوں نے دعویٰ کیا کہ ابتدا میں مسلمانوں کے ہاں احادیث طیبہ کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ دوسری یا تیسری صدی ہجری میں، جب مسلمانوں کو نئے نئے مسائل سے واسطہ پڑا اور ان میں باہم مذہبی اور سیاسی اختلافات نے زور پکڑا، تو انھوں نے اپنے اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لیے خود احادیث تراشیں اور انھیں حضور ﷺ کی

طرف منسوب کر دیا۔ مستشرقین یہ الزام صرف کسی گمراہ فرد یا فرقے پر نہیں لگاتے، بلکہ ان کے اس الزام کی زد میں مسلم حکومتیں، فقہائے کرام اور محدثینِ عظام سب آتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، امام زہری اور امام بخاری جیسی ہستیاں جن کی زندگیاں احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت اور خدمت کے لیے صَرف ہوئیں، مستشرقین احادیث گھڑنے کا الزام لگاتے ہوئے ان کو بھی معاف نہیں کرتے۔

مستشرقین کی کتابوں کے عمیق مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مستشرق اسلام کے خلاف کوئی شوشہ چھوڑتا ہے، تو دوسرے مستشرقین اس شوشے کو ہوا دینے ہی کو غیر جانبدارانہ اور معروضی تحقیق کا نام دیتے ہیں۔ حدیث پاک کے متعلق جس مستشرق نے زیادہ شہرت حاصل کی ہے، وہ مشہور یہودی مستشرق گولڈ زیہر (Goldziher) ہے۔ دائرۂ معارف اسلامیہ کا مقالہ نگار اس کے متعلق لکھتا ہے:

”گولڈ زیہر نے حدیث کے متعلق جو لکھا ہے، علم اس کا مرہونِ منت ہے، مستشرقین کی اسلامی تحقیقات پر جتنا اثر انداز گولڈ زیہر ہوا ہے، اتنا اس کا کوئی دوسرا معاصر مستشرق نہیں ہوا“[۴]۔

گولڈ زیہر کی کوششوں کے متعلق مرحوم ڈاکٹر فواد سیز گین لکھتے ہیں:

”گولڈ زیہر نے اپنے ان خیالات کا اظہار اپنی کتاب ”دراساتِ محمدیہ“ میں کیا، جو ۱۸۹۰ء میں جرمن زبان میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کے شائع ہونے کے بعد حدیث پر تحقیق کے لیے یہ کتاب اہلِ مغرب کیلئے بنیادی دستاویز بن گئی۔ بیشتر مستشرقین

---

[۴] ملاحظہ ہو: ’سیرت ضیاء النبی‘، از پیر محمد کرم شاہ ازہری، ج ۷، ص ۱۷۔

اس کتاب کے حوالے سے اپنے نتائجِ فکر پیش کرتے رہے۔ پروفیسر شاخت (J. Schacht) نے فقہی احکام سے متعلق احادیث پر کام کیا، گلیوم (A.Guillaume) کی ''ٹریڈیشنز آف اسلام'' وجود میں آئی، جو گولڈ زیہر کی تحقیقات کا چربہ تھی۔ مار گولیتھ (Margoliouth) کے گولڈ زیہر کے افکار کی روشنی میں اپنے نظریات پیش کیے۔ علاوہ ازیں ہوروفتش، (J.Horowitz) ہورست (H.Hosrt)، فون کریمر (A.Von. Kremer)، مویر (W.Wuir) کیتانی (L.Caetani) اور نکلسن (A.R, Nicholoson) وغیرہ نے بھی اس میدان میں اپنے اپنے نتائج فکر بیان کیے ہیں، جو سارے کے سارے کم و بیش گولڈ زیہر ہی کے افکار کی صدائے بازگشت ہیں''[۵]۔

ٹیڑھی بنیاد پر سیدھی تعمیر کا خواب

اہلِ خرد بخوبی جانتے ہیں کہ جس دیوار کی بنیاد میں ہی ٹیڑھ پن ہو وہ آخر تک ٹیڑھی ہی رہتی ہے، بنیاد کی اِصلاح کیے بغیر اُسے سیدھا کرنا دیوانے کا خواب ثابت ہو گا۔ راقمِ تحریر کی رائے میں بد قسمتی سے انکارِ حدیث کا محاذ کھولنے والوں سے اس کی بنیاد میں ہی ٹیڑھ پن اور کج روی رہ گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کو بار بار یہ اعلان کرنا پڑتا رہا:

'واضح رہے کہ یہ ادارہ نہ کسی فرقہ سے متعلق ہے اور نہ ہی (خدانکردہ) کسی نئے مذہب کا داعی۔ نہ ہی یہ منکرِ حدیث ہے اور نہ ہی (معاذاللہ) منکرِ شانِ رسالت ﷺ، اس کی کوشش یہ ہے کہ دین کو اس کے اصلی رنگ میں دنیا کے سامنے پیش کیا جائے، خدا اسے کامیاب کرے، والسلام'[۶]۔

۵۔ ملاحظہ ہو: 'سیرت ضیاء النبی ﷺ'، ج۷، ص۱۹۔

۶۔ ملاحظہ ہو: 'مقامِ حدیث'، طلوعِ اسلام ٹرسٹ، لاہور، چھٹا ایڈیشن ۲۰۰۱ء، ص: س، ش۔

اگر واقعی یہ تحقیق و تفتیش کا کام اسی سلسلۂ ذہب کی ایک کڑی تھا، جو دین اسلام میں مطلوب و محمود ہے، تو پھر بے جا صفائی اور تاویلیں پیش کرنا چہ معنٰی دارد۔! اہلِ حق کی مخالفت ہر دور میں ہوتی رہی ہے اور وہ صبر واستقامت کا مظاہرہ کرتے رہے، آپ بھی اپنا کام جاری رکھتے اور فیصلہ آخرت کے دن پر چھوڑ دیتے، اللہ اللہ خیر سے اللہ۔! لیکن بار بار کے اصرار سے لگتا ہے کہ ضرور 'دال میں کچھ سفید' بھی ہے، پوری کی پوری دال، بہر حال کالی نہیں ہے۔ اگر یہ فرمانِ رسول ﷺ آپ کی نظر میں صحیح ہو، تو یہاں یہی بات بالکل صادق آتی نظر آتی ہے، چنانچہ جب آپ ﷺ سے برے کام کی تعریف پوچھی گئی، تو یوں ارشاد فرمایا:

«وَالْإِثْمُ مَا حَاكَ فِي صَدْرِكَ، وَكَرِهْتَ أَنْ يَطَّلِعَ النَّاسُ عَلَيْه»[ے]

ترجمہ:" اور برائی وہ ہے جو تمھارے سینے میں کھٹکے اور تمھیں یہ بات ناپسند ہو کہ لوگ اس پر مطلع ہو جائیں"۔

جب ہم نے 'مقامِ حدیث' نامی کتاب میں ایک مضمون 'حدیث کی صحیح پوزیشن' کا مطالعہ کیا، تو ابتدا ہی میں ہمیں بھی ان حضرات کی 'صحیح پوزیشن' کا اندازہ ہو گیا، چند ایسی باتیں نظر سے گزریں، جنھیں دیکھ کر اندازہ ہوا کہ دانستہ یا نادانستہ اس کی بنیاد ہی ٹیڑھ پن کا شکار ہو گئی یا پھر ٹیڑھی کر دی گئی ہے، خدا خیر کرے آگے جا کر اس کا نتیجہ اور مآل کیا نکلے گا۔۔۔! تاہم پوری کتاب پر تبصرہ کرنے کا نہ یہ موقع ہے اور نہ آئندہ کبھی فرصت۔ بنیادی طور پر دو طرح کے اعتراضات ہیں، انھیں ذیل میں جواب کے ساتھ لکھا جاتا ہے:

ے ملاحظہ ہو: 'مسند احمد بن حنبل'، ج۲۹، ص۱۷۹، رقم: ۱۷۶۳۱۔

پہلا اعتراض: قرآن کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے کسی اور چیز کی حفاظت کا ذمہ نہیں لیا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے نہ تو احادیث کو جمع کیا، نہ اُن کے جمع کرنے کا حکم دیا اور نہ ان کی حفاظت کا وعدہ کیا۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ نے قرآن کے ایک ایک لفظ کو لکھوایا، زبانی یاد کرایا، لوگوں سے سُنا، دہرایا اور ہر طرح سے اطمینان فرمالیا کہ اس کا ایک ایک حرف محفوظ کر دیا گیا ہے۔ اگر احادیث دین کا جُز ہوتیں، تو آپ ﷺ کو ان کے متعلق بھی یہی انتظام فرمانا چاہیے تھا، منصبِ رسالت کا یہی تقاضا تھا اور بہ حیثیتِ رسول، حضور ﷺ کا یہ فریضہ کہ دین کو محفوظ ترین شکل میں اُمت کے پاس چھوڑتے، لیکن حضور ﷺ نے احادیث کے متعلق کوئی انتظام نہیں فرمایا، بلکہ خود کُتبِ احادیث میں اس کے برعکس موجود ہے کہ قرآن کے علاوہ اور چیزوں کو مٹانے کا حکم دیا[۸]۔

جواب: بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے قرآن کی جمع وتدوین کی ذمہ داری خود لی ہے، بلکہ اس بات کی ذمہ داری بھی کہ قیامت تک اس میں کسی قسم کا ردوبدل اور کسی نوعیت کی تحریف والحاق نہیں ہو سکے گا، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝ [القیامۃ ۷۵: (۱۷)]

یقیناً اس (کتاب) کا جمع کرانا اور اس کا پڑھانا ہمارے ذمہ ہے۔

اور ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ [الحجر ۱۵: (۹)]

یقیناً ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

۸۔ 'مقامِ حدیث'، ص: ۴۔۵۔

معترض نے مذکورہ آیات سے یہ سمجھا ہے کہ قرآن کے علاوہ کسی چیز کی حفاظت، جمع اور تدوین کی ذمہ داری کا معلوم نہیں ہوتا۔

یہاں بنیادی غلطی یہ ہوئی کہ سورۃ القیامہ کی ذکر کردہ آیت کے بعد والی آیات کو نہیں دیکھا یا دیکھ کر اَن دیکھا کر دیا، جہاں واضح طور پر 'قرآن کے بیان' یعنی: احادیث کی حفاظت کی ذمہ داری کا بھی بتایا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۝ [القیامۃ۷۵: (۱۹)]

یہ 'بیان' کیا ہے؟ قرآن کی تفسیر و تشریح ہی تو ہے، جسے سورۃ النحل آیت نمبر ۴۴ میں 'فریضۂ رسالت' قرار دیا گیا، نیز اسی 'بیان' کو عالمِ اسلام 'احادیث' کے نام سے جانتا ہے۔

ایک لطیف نکتہ

یہاں ایک بات ذہن نشین رہے کہ سورۃ القیامہ کی آیات میں واضح ہے کہ یہاں ترتیب وار حفاظت اور جمع و تدوین مقصود ہے، یعنی: پہلے قرآن کریم کی جمع و تدوین اس طور پر ہو کہ اس کے الفاظ کے ساتھ ساتھ طریقۂ قراءت بھی زبانی اور کتابی صورت میں محفوظ ہو جائے اور پھر اس کے بعد قرآن کا بیان یعنی: احادیث کی حفاظت اور جمع و تدوین کا کام ہو۔

ہم اپنے مدّعا پر مخالف سے ہی دلیل لاتے ہیں، چنانچہ آیت میں ہے: ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۝﴾، 'ثُمَّ' حرف ہے،

(۱) جو عام طور پر اس مقام پر آتا ہے، جہاں کوئی ترتیب بیان کرنا مقصود ہو۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ پہلے اس نے کھانا کھایا، پھر پانی پیا۔

(۲) لیکن ضروری نہیں کہ ثم ہر جگہ ترتیب کے معنی ہی میں استعمال ہو یہ 'و' (اور) کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

(۳) نیز کبھی یہ زائد[۹] ہوتا ہے

اور (۴) اس کا ایک معنیٰ 'اس پر بھی'، 'اس کے باوجود' بھی ہوتے ہیں[۱۰]۔

مذکورہ چار معانی میں پہلا معنیٰ ترتیب کا فائدہ دے گا، یعنی: پہلے قرآن کے متن اور قراءت کی جمع و تدوین کا کام ہو گا اور پھر اس کے بیان کا یعنی: احادیث کی جمع و تدوین کا۔

دوسرا معنیٰ بھی اسی قسم کا فائدے دے گا کہ قرآن کے متن، قراءت اور بیان یعنی: احادیث کی حفاظت اور جمع و تدوین کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے لی ہے۔

تیسرے معنیٰ سے بھی ہمارے مدعا میں کوئی فرق نہیں پڑے گا، البتہ چوتھے معنیٰ میں ایک لطیف نکتہ پیدا ہو گا: یقیناً اس (کتاب) کا جمع کرانا اور اس کا پڑھانا ہمارے ذمہ ہے اور جب ہم پڑھیں تو اس (پڑھنے) کی پیروی کرو، (مستقبل میں منکرین اگرچہ اعتراض کریں گے تاہم) اس کے باوجود یقیناً اس کا بیان کرنا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔ اس آیت کی مزید تفسیر و تشریح زیرِ نظر کتاب میں ہے، وہاں مطالعہ کیا جائے۔

نبی کریم ﷺ کے من جملہ فرائضِ منصبی میں یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ آیات کی تفسیر و تشریح بیان کریں، چنانچہ سورۃ النحل آیت (۴۴) میں ارشاد ہوتا ہے:

---

۹ زائد کے یہ معنیٰ نہیں کہ وہ بلا ضرورت استعمال کیا گیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس حرف کے (اس مقام میں) الگ معنیٰ کچھ نہیں، لیکن اہلِ زبان اسے ایسے مواقع پر استعمال کرتے ہیں اور اس سے کلام میں خاص وزن پیدا ہو جاتا ہے، اگر اس موقع پر قرآن اسے استعمال نہ کرتا تو قرآن کا انداز غیر فصیح ہو جاتا۔ (ملاحظہ ہو: 'لغات القرآن'، پیش لفظ، از غلام احمد پرویز، ص ۲۹)۔

۱۰ تلخیص از 'لغات القرآن'، ص ۴۰۴۔

﴿وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الذِّکۡرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیۡہِمۡ وَلَعَلَّہُمۡ یَتَفَکَّرُوۡنَ ○﴾

یعنی: اور ہم نے اس ضابطۂ قوانین کو تیری طرف نازل کیا ہے، تاکہ جو کچھ لوگوں کی طرف نازل کیا گیا ہے، تو اسے لوگوں پر ظاہر کر دے اور تاکہ وہ اس میں غور وفکر کریں۔

یعنی: قرآن نے یہ کہا ہے کہ (۱) خدا نے رسول کی طرف کتاب نازل کی ۔ (اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الذِّکۡرَ)

(۲) لیکن یہ کتاب در حقیقت تمام انسانوں کی طرف نازل کی گئی ہے (مَا نُزِّلَ اِلَیۡہِمۡ) اس لیے

(۳) رسول کا فریضہ ہے کہ اسے (اپنے تک ہی محدود نہ رکھے) بلکہ اسے لوگوں پر ظاہر کر دے۔ (لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ) اسے ان تک پہنچا دے۔ (بَلِّغۡ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ)[۱۱]۔

رہا یہ اعتراض کہ ’حضور ﷺ نے احادیث کے متعلق کوئی انتظام نہیں فرمایا، بلکہ خود کُتبِ احادیث میں اس کے برعکس موجود ہے کہ قرآن کے علاوہ اور چیزوں کو مٹانے کا حکم دیا‘، تو اس کا تسلی بخش جواب ان شاء اللہ آپ کتاب میں پڑھیں گے اور اپنے دل و نظر کو ٹھنڈا کریں گے۔

دوسرا اعتراض: موجودہ مجموعہ ہائے احادیث میں پائی جانے والی وہ روایات ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی طرح صحابۂ کرام بھی احادیث کو دین کا جزو

---

۱۱ ’لغات القرآن‘، ص۳۶۸۔۳۶۹۔

نہیں سمجھتے تھے، اگر سمجھتے ہوتے تو اس کی نشر واشاعت کا اہتمام فرماتے اور کوئی مجموعہ مرتب کر کے ضرور شائع کرتے، لیکن ان حضرات نے جمع و تدوین حدیث کے متعلق کوئی اقدام نہیں کیا۔ نیز جو کچھ کام تدوینِ حدیث کا ہوا، وہ انفرادی طور پر تیسری صدی ہجری میں شروع ہوا، اس کام کو کرنے والے سارے عجمی تھے مقامِ حیرت ہے کہ عربوں میں سے کسی نے بھی اس عظیم کام کا بیڑہ نہ اُٹھایا اور احادیث کی جمع و تدوین کا کام غیر عربوں (عجمیوں) کے ہاتھوں سر انجام پایا۔

جواب: ان تمام باتوں پر بھی مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے زیرِ نظر کتاب میں تفصیل سے کلام کیا ہے اور ممکنہ پیدا ہونے والے اشکالات و شبہات کا تشفی بخش جواب دیا ہے، لہٰذا اس کے لیے کتاب کا مطالعہ جاری رکھیں۔ اس کے علاوہ امام المتکلمین حافظ محمد ایوب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی معرکۃ الآراء تحریر 'فتنۂ انکارِ حدیث' کا مطالعہ بھی اہم ہے، جس میں نہایت خوش اسلوبی سے اعتراضات کے شافی جواب دیے گئے ہیں۔ البتہ ہم یہاں صرف ایک لطیفہ پیش کرنا چاہیں گے کہ آپ کے بقول جس طرح عربوں کو جمع و تدوین احادیث کی نہ سوجھی تھی، بلکہ یہ کام غیر عرب (عجمیوں) نے سر انجام دیا، اسی طرح عربوں کو 'انکارِ حدیث' کی بھی کبھی نہیں سوجھی تھی، یہ بھی ایک غیر عرب (عجمی) کو چودھویں صدی میں ہی سوجھی اور وہ بھی بڑی دور کی، چنانچہ اس نے تحقیق و تفتیش کے لبادے میں انکارِ حدیث کے کام کا آغاز کیا، شاید عربی میں اسی کے لیے کہا جاتا ہے: «كَرَّ إِلىٰ مَا مِنْهُ فَرَّ»، فيا أسَفَی علی عجمی...!

مذکورہ دو بنیادی اعتراضات کے علاوہ بھی دیگر اعتراضات ہیں، ہم یہاں اُنھیں ذکر کر کے گفتگو طویل نہیں کرنا چاہتے، مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے تقریباً تمام پر گفتگو کر کے اُن کے تقلی

اور عقلی جواب دیے ہیں، اگر وہ سب قارئین کے پیشِ نظر رہیں، تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اُمید ہے کہ معاملہ بالکل روشن ہو جائے گا اور احادیث کی حجیت پر یقین مزید پختہ ہو جائے گا۔

انکارِ حدیث کے اسباب

اہلِ علم کے مطابق انکارِ حدیث کے کئی اسباب ہیں، جن میں سرفہرست یہ ہیں:

۱۔ عقل کو ہر طرح سے معیار سمجھنا

۲۔ جہالت (جہلِ مرکب)

۳۔ خواہشاتِ نفس کی پیروی

۴۔ دنیاوی مال کا حصول

۵۔ بیرونی و خارجی عوامل سے مرعوب ہونا

پاکستان میں حجیتِ حدیث پر تصانیف کا آغاز

تقسیمِ ہند کے بعد علمائے کرام نے جہاں علومِ حدیث کے مختلف پہلوؤں پر کام کیا، وہیں خاص انکارِ حدیث کے فتنے کی سرکوبی کے لیے بھی گراں قدر تقریری، تحریری اور تصنیفی کام سرانجام دیے، چنانچہ صرف پہلی دہائی (۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۷ء) میں ہونے والے چند اولین کام درج ذیل ہیں:

۱۔ 'سنتِ خیر الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام': ۱۹۵۳ء میں جسٹس پیر محمد کرم شاہ ازہری رحمۃ اللہ علیہ نے اسے تحریر فرمایا، جس میں فتنۂ انکارِ سُنت پر تحلیلی و تنقیدی نظر، منکرینِ سُنت حضرات کی غلط فہمیوں کا ازالہ، شبہات کا رد اور اعتراضات کے جواب، عقلی و نقلی دلائل کے ساتھ ساتھ تاریخ و تدوینِ حدیث اور محدثینِ کرام کے احوال کو نہایت عمدگی سے قلم بند کیا ہے۔ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی نے اسے شائع کیا۔ پیر صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے مقدمے

میں یادگارِ اسلاف مفتی محمد اطہر نعیمی صاحب حفظہ اللہ بن تاج العلماء مفتی محمد عمر نعیمی رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق لکھتے ہیں:

''میں محترم مولانا محمد اطہر صاحب نعیمی کا تہِ دل سے مشکور ہوں جن کے پیہم تقاضوں نے مجھے اس فرض کی ادائیگی کی طرف متوجہ کیا اور مجھے مجبور کر دیا کہ میں اپنی تعلیمی مصروفیات کے باوجود اس کے لیے وقت نکالوں''[۱۲]۔

۲۔ 'انوارِ حدیث': ۱۹۵۴ء میں علامہ سید محمد ہاشم فاضل شمسی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے تحریر فرمایا، جو پہلے پہل 'المکتبہ' نیو نہام روڈ، اندرون کھٹاؤ مارکیٹ، کراچی سے شائع ہوئی۔ پھر ۱۹۸۵ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن ورلڈ فیڈریشن آف اسلامک مشنز کراچی سے ڈاکٹر سید حامد حسن بلگرامی کے مقدمے اور مصنف کی ترتیبِ جدید کے ساتھ شائع ہوا۔ نیز اب اس کا تیسرا ایڈیشن تخریج وحواشی کے ساتھ بحمد اللہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کی وجہِ تسمیہ مصنف رحمۃ اللہ علیہ کی باب چہارم میں موضوع روایات سے متعلق ذکر کردہ یہ عبارت ہے:

''۔۔۔اہلِ ایمان واہلِ طاعت محدثین نے ان حدیثوں کا بھی پتہ لگایا اور ان گھڑنے والوں سے اقبالِ جرم بھی کرا لیا، مگر آج کے عجمیت پسند، خسرو پرویز سے زیادہ اسلام کے خلاف آتش افروزی میں منہمک ہیں، اگلوں نے چند حدیثیں گھڑیں اور انھوں نے ساری حدیثوں کو رد کر دیا، مگر وَاللّٰہُ مُتِمٌّ نُوْرِہٖ (اللہ اپنے نور کو مکمل فرمائے گا)، '**انوارِ حدیث**' عام ہو کر رہے''[۱۳]۔

---

[۱۲] 'سنتِ خیر الانام'، ص۲۹۔

[۱۳] 'انوارِ حدیث'، ورلڈ فیڈریشن آف اسلامک مشنز کراچی، ۱۹۸۵ء، ص۸۹۔

۳۔ 'تاریخ علم حدیث': ۱۹۵۴ء میں مفتی سید محمد عمیم الاحسان مجددی برکتی رحمۃ اللہ علیہ نے اس جامع ووقیع رسالے کو تحریر فرمایا، جو 'المکتبۃ' نیو نہام روڈ، اندرون کھٹاؤ مارکیٹ، کراچی سے شائع ہو کر مقبولِ عام ہوا۔ اس میں علمِ حدیث کی تاریخ کو جس عمدہ پیرائے میں مرتب کیا گیا ہے، اسے پڑھ کر قاری حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اصل مقام و مرتبے کو بخوبی سمجھ لیتا ہے، یہ کتاب گندم نما جَو فروشوں سے بچنے کے لیے نہایت ممد و معاون ہے۔

۴۔ 'فتنۂ انکارِ حدیث': اکتوبر ۱۹۵۷ء میں امام المتکلمین حافظ محمد ایوب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ معرکۃ الآراء کتاب ادارہ تحقیقِ حق، کراچی سے شائع ہوئی، اس میں منکرین کی جانب سے اُٹھائے جانے والے تقریباً تمام ہی اعتراضات کے مسکت جواب دیے گئے ہیں۔ اگرچہ یہ سلسلۂ تحریر ۱۹۵٦ پہلے سے جاری تھا اور ۱۸ر دسمبر ۱۹۵٦ء کو پہلے مختصر رسالہ بنام 'فتنۂ انکارِ حدیث' اسی ادارے نے شائع کر دیا تھا۔ تاہم جب منکرین کے ایوانوں میں زلزلہ آیا اور انھوں نے اپنے ماہنامے میں کچھ دیگر اشکالات واعتراضات شائع کیے، تو اشاعتِ جدید کے وقت ان سب کے جواب کو بھی شامل کتاب کر لیا گیا۔ خدا کرے کوئی مردِ مجاہد اس پر جدید تقاضوں کے مطابق کام کرے اور دارین کی سعادتیں پائے۔۔۔! مذکورہ تحریروں کے علاوہ بھی علمائے اہلِ سنت نے مختلف مواقع پر اس موضوع پر اپنی کُتب ورسائل یاد گار چھوڑے ہیں، اللہ تعالیٰ سب کو جزائے خیر عطا فرمائے، آمین۔

عالمی سطح پر ہونے والے چند تحقیقی کام

'صحیفۂ ہمام بن منبہ': ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم کی تحقیق وترجمہ کے ساتھ اسلامک پبلی کیشنز سوسائٹی، حیدرآباد دکن (ہندوستان) سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی، جس کے مقدمے میں

تفصیل سے تاریخ وتدوین حدیث پر مدلل کلام کیا گیا ہے۔ پھر یہ گراں قدر تحقیقی کام پاکستان سے بھی شائع ہو کر مقبول عام ہوا۔

رہا یہ خیال کہ شاید اردو زبان میں ہی حجیتِ حدیث پر لکھا گیا ہے، تو بالکل درست نہیں ہے، علمائے اسلام نے عالمی سطح پر بھی دیگر زبانوں میں کئی کُتب اور تحقیقی مقالہ جات لکھے ہیں، جن میں ڈاکٹر فواد سیز گین کا تحقیقی مقالہ صحیح بخاری کے مصادر، نیز انھیں کی دیگر کُتب، محمد مصطفیٰ اعظمی کی 'دراسات فی الحدیث النبوی وتاریخ تدوینہ' اور مصطفیٰ سباعی کی 'The Sunnah and its Role in Islamic Legislation'، وغیرہ قابلِ ذکر ومطالعہ ہیں، ان کتب میں مستشرقین کے اعتراضات کے کافی وشافی جواب اُنھیں کے اسلوب ومنہجِ تحقیق کی روشنی میں دیے گئے ہیں، جنھیں پڑھ کر انصاف پسند شخص کے لیے حجیتِ حدیث کا اقرار کیے بغیر چارہ نہیں رہتا، واللہ المُوفّق للهداية وهو المستعان۔

کتاب 'انوارِ حدیث' پر کیے جانے والے چند کام

۱۔ دو مطبوعہ نسخوں سے متنِ کتاب کا بالاستیعاب تقابل کیا گیا ہے، جس میں المرکز الاسلامی کراچی کے شائع کردہ نسخے کو اصل قرار دیا ہے۔

۲۔ مقدور بھر نصوص کی تخریج کی گئی ہے، جس میں قرآنی آیات کی تخریج میں پہلے سورت کا نام، پھر اس کا نمبر اور پھر آیت نمبر درج کیا گیا ہے، مثلاً: المؤمنون ۲۳: (۵۳) وغیرہ۔ جب کہ احادیث کی تخریج میں پہلے کتاب کا نام، پھر جلد اور صفحہ نمبر اور پھر رقمِ حدیث درج کیا گیا ہے، مثلاً: موطأ امام مالک، ج۱، ص۳۳۰، رقم: ۹۳۶ وغیرہ۔

۳۔ تخریجِ نصوص میں ضرورتاً عربی عبارات کو حاشیے میں طلبہ کی سہولت کے لیے نقل کیا گیا ہے۔

۴۔ حسبِ ضرورت بائیبل کے حوالہ جات بھی اردو اور انگریزی متن کے ساتھ حاشیے میں نقل کیے گئے ہیں۔ انگریزی تراجم King James Version سے لیے گئے ہیں۔

۵۔ مشکل الفاظ کے معانی کو حاشیہ میں لکھا گیا ہے۔

۶۔ جگہ بہ جگہ مفید حواشی بغرضِ اِفادۂ عام لگائے گئے ہیں۔

۷۔ مصنف رحمۃ اللہ علیہ کے حواشی کے آخر میں بغرضِ فرق '۱۲ منہ' لکھا گیا ہے۔

۸۔ مصنف رحمۃ اللہ علیہ کا پہلی بار مختصر لیکن جامع تعارف شامل کیا گیا ہے۔

۹۔ تقدیم نگار ڈاکٹر سید حامد حسن بلگرامی رحمۃ اللہ علیہ کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔

۱۰۔ آخر میں فہرست کتابیات کو شامل کیا گیا ہے۔

تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ

اس کام میں جو حسن وخوبی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ہے، نیز جو کوئی خامی یا کمی رہ گئی ہے، وہ یقیناً محقق کی جانب سے ہے۔ اللہ تعالیٰ مصنف، مقدمہ نگار، محقق، معاونین، ناشر اور قارئین کو دارین کی سعادتیں عطا فرمائے۔۔۔!

آمین بجاہ سیدنا محمد خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

محقق (عفی عنہ)

دسمبر ۲۰۲۰ء، کراچی، (پاکستان)

حیاتِ مصنّف رحمۃ اللہ علیہ پر اِک نظر

(پیدائش ۲/ اگست ۱۹۱۴ء۔ وصال ۱۵/ اگست ۱۹۸۸ء)

سید محمد ہاشم فاضل شمسی رحمۃ اللہ علیہ اپنے دور کے یگانہ روزگار فاضل تھے، قرآن وحدیث کا انھوں نے بہت ہی عمیق نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ اندازِ بیان منطقی اور معقولی تھا۔ تحریر و تقریر پر کامل دسترس رکھتے تھے۔ ان کا خطاب فاضلانہ اور علمی نکات پر مشتمل ہوتا تھا۔ اہلِ علم تو ان کی گفتگو سے مسحور ہوتے ہی تھے، عوام الناس بھی ان کے خطاب سے فیض یاب ہوتے تھے۔ تحریر میں منطقی استدلال سے کام لیتے اور عقلی دلائل کے ساتھ سلسلۂ کلام اس طرح آگے بڑھاتے کہ قاری پر محویت طاری ہو جاتی، مسلمہ اصول و قواعد کو بنیاد بنا کر گفتگو کرتے اور دورانِ کلام بہت کم کسی آیت یا حدیث یا کسی کتاب کا حوالہ دیتے، کہیں ضرورت محسوس کرتے تو آیت یا حدیث کا مختصر سے مختصر حصہ نقل کرتے یا اشارہ کر دیتے کہ فلاں آیت کا مطالعہ کیجیے۔ اول سے آخر تک مربوط اور مسلسل گفتگو کرتے۔ کیا مجال کہ کسی جگہ جھول محسوس ہو یا غیر ضروری تفصیل سے واسطہ پڑے۔ ذیل میں آپ کی حیات و خدمات پر مختصر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

خاندانی پس منظر

آپ کے جدِ اعلیٰ خواجہ سید عبد اللہ چشتی مودودی بکھری ثم شیخ پوری رحمۃ اللہ علیہ ہیں، جن کا سلسلۂ نسب سات واسطوں سے حضرت خواجہ سید قطب الدین مودود چشتی رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے، تفصیل عن قریب آتی ہے۔ ہم یہاں مختصراً خواجہ سید عبد اللہ چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات قلم بند کرتے ہیں۔ سلطنت شاہانِ مغلیہ کے زمانے میں آپ رحمۃ اللہ علیہ اپنے علاقے بھکر (ٹھٹہ، سندھ) سے سیر و سیاحت کرتے ہوئے بہار پہنچے۔ حضرت مخدوم جہاں شاہ شرف الدین یحییٰ

منیری قدّس سرّہ کی خانقاہ میں حاضر ہوئے اور کچھ عرصہ یہاں قیام فرمایا۔ یہاں بشارت ملی کہ اسی بہار کے قرب وجوار میں آپ کو قیام کی ضرورت ہے اور جگہ کا تعین بھی ہو جائے گی۔ چنانچہ آپ نے بہار سے تقریباً ۱۴ کوس (8.77 میل) جنوب کی جانب ایک جگہ رات میں قیام فرمایا، نماز کے لیے وضو کیا اور اپنی مسواک زمین میں نصب کر دی، اسی طرح اپنا عصا بھی زمین میں گاڑ دیا اور پھر نماز ادا فرمائی۔ صبح دیکھا کہ مسواک ہری ہو گئی ہے اور پتّے نکل آئے ہیں، جب عصا اُکھاڑا تو وہاں سے پانی نکل آیا۔ خواجہ عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ یہ علامات دیکھ کر سمجھ گئے کہ یہیں اُن کی مستقل قیام گاہ ہو گی، چنانچہ اسی ارادے سے وہاں یادِ الٰہی میں مصروف ہو گئے۔

آپ کے والد ماجد سید اسد اللہ قدس سرہ بیٹے کی مفارقت گوارانہ کر سکے اور اپنے اہل وعیال کے ساتھ بھکر (ٹھٹہ) سے آپ کی تلاش میں روانہ ہوئے اور بالآخر اسی مقام پر ملے اور وہیں رہ گئے۔ ان سادات کے قیام کی وجہ سے وہاں ایک بستی آباد ہو گئی، جو 'شیخ پورہ' کے نام سے مشہور ہوئی۔ اب تک آپ کی اولاد مالکانہ حیثیت سے اس بستی میں آباد ہے اور آپ کا مزارِ فیض انوار بھی اسی بستی میں مرجعِ خاص وعام ہے۔ موجودہ زمانے میں یہ جگہ چھوٹا شیخ پورہ، شہر نوادہ، صوبۂ بہار (ہندوستان) میں واقع ہے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے حضرت خواجہ تاج محمود حقانی رحمۃ اللہ علیہ بھی علم وفضل میں کمال حاصل کیے ہوئے تھے، ان کے وقت میں اکثر جاگیریں دربارِ شاہی سے بمدِ معاش ومعافی ملی ہوئی تھیں۔ مختصر یہ کہ خواجہ سید عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں ایک سے بڑھ کر ایک عظیم شہرۂ آفاق شخصیات پیدا ہوئیں، اللہ تعالیٰ ان کے فیوض وبرکات سے ہمیں بھی وافر حصہ عطا فرمائے [۱۴]۔

۱۴؎ ملاحظہ ہو: ماہنامہ صوفی، دہلی، جون ۱۹۲۱ء، ص ۳۹۔

نام ونسب

فاضل شمسی کے جدِ امجد خواجہ سید محمد واجد حسین رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کا نام 'سید منظور نبی' عرف 'محمد ہاشم' رکھا۔ آپ کا سلسلۂ نسب اِکتیس واسطوں سے سیدنا امام حسین بن علی رضی اللہ عنہما تک پہنچتا ہے، سلسلۂ ذہب یوں ہے:

"سید محمد ہاشم فاضل شمسی بن سید محمد قاسم مودودی بن سید واجد حسین بن سید انور علی بن سید فتح علی شیخپوری (بہوڑی شاہ) بن سید غلام عبد اللہ بن سید فصیح اللہ چشتی بن خواجہ سید عنایت اللہ چشتی بن خواجہ سید تاج محمود حقانی چشتی بن خواجہ سید قطب الدین ثانی چشتی بن خواجہ سید عبد اللہ چشتی بھکری ثم شیخپوری بن خواجہ سید اسد اللہ چشتی بکھری بن خواجہ سید برہان الدین چشتی بن خواجہ سید عبد الرحمن چشتی بن خواجہ سید محمد جان چشتی (خلیفہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ) بن خواجہ سید سمعان ثانی چشتی بن خواجہ سید محمد منصور چشتی بن خواجہ سید قطب الدین مودود چشتی بن خواجہ سید ابو یوسف چشتی بن خواجہ سید محمد سمعان اول بن خواجہ سید ابراہیم بن خواجہ سید شاہ حسین بن سید شاہ عبد اللہ اول بن سید حسین اصغر بن حضرت سید امام علی نقی بن حضرت سید امام محمد تقی بن حضرت سید امام علی رضا بن حضرت سید امام موسیٰ کاظم بن حضرت سید امام جعفر صادق بن حضرت سید امام محمد باقر بن حضرت سید امام علی اوسط زین العابدین بن حضرت سید امام حسین شبیر بن حضرت سیدنا امام علی مرتضیٰ بن ابی طالب رضی اللہ عنہم"[۱۵]۔

۱۵؎ یہ شجرۂ نسب ہمیں جناب سید محمد سلمان چشتی حفظہ اللہ (بہار، ہندوستان) نے ارسال کیا ہے، آپ خانوادۂ خواجہ قطب الدین سید مودود چشتی رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ محقق

=

تنبیہِ ضروری: ایک شجرۂ نسب کتاب 'اشرافِ عرب' ص۲۳۹ میں بھی درج ہے، تاہم مصدقہ ذرائع کے مطابق یہ درست نہیں ہے۔ ان شاء اللہ تفصیل کسی اور موقع پر بیان کی جائے گی۔

پیدائش

آپ ۹/ رمضان المبارک ۱۳۳۲ھ بمطابق ۲/ اگست ۱۹۱۴ء بروز اتوار محلہ چاند پورہ، موضع کاندھا (صوبۂ بہار) ہندوستان میں پیدا ہوئے[۱۶]۔

تعلیم و تربیت

ابتدائی تعلیم گھر میں ہی حاصل کی۔ پھر ۱۹۲۲ء میں آٹھ سال کی عمر میں الحاج سید نور الہدیٰ بانی مدرسہ اسلامیہ شمس الہدی، پٹنہ (ہندوستان) کے کہنے پر مدرسے میں داخلہ لیا، جہاں آپ کے چچا مولانا سید معین الدین آخری درجے کی کتابیں پڑھتے تھے۔ مدرسے کا نصابِ تعلیم پندرہ سال پر محیط تھا، جسے فاضل شمسی نے گیارہ سال میں ۱۹۳۲ء میں مکمل کر لیا، نیز اسی دوران پٹنہ یونیورسٹی سے بی۔ اے کا امتحان بھی پاس کیا۔ مادرِ علمی کی نسبت سے "فاضل شمسی" کہلائے، آپ دورانِ تعلیم مدرسے میں ممتاز طلبہ میں شمار کیے جاتے تھے۔

=

نیز ملاحظہ ہو:

http://syedshamsi.blogspot.com/2012/01/family-background-allama-syed-mohammed.html?m=0

[۱۶] علامہ عبد الحکیم شرف قادری، 'عظمتوں کے پاسبان'، ص ۲۸۲۔ ۲۸۸۔

'مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ' پٹنہ کا مختصر تعارف

یہ مدرسہ ریاست بہار (ہندوستان) کا ایک ایسا قدیم اسلامی تعلیمی ادارہ ہے، جس نے بہار کی طرح خود بھی اپنے قیام کے ۱۰۰ اسال پورے کر لیے ہیں۔ اس ادارے کو جسٹس نور الہدیٰ نے اپنے والد گرامی مولوی 'شمس الہدیٰ' مرحوم کے نام پر ۱۲/ نومبر ۱۹۱۲ء کو قائم کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار جسٹس نور الہدیٰ مرحوم اپنی زمین داری کی دیکھ بھال کے لیے موضع سانڈھا ضلع پٹنہ تشریف لے گئے، قریب کے ایک گاؤں میں ایک مسلمان کا انتقال ہو گیا تھا، جب کہ وہاں نمازِ جنازہ پڑھانے والا کوئی نہیں تھا، جب ان لوگوں کو جج صاحب کی آمد کی اطلاع ملی، تو وہ لوگ آپ کے پاس آئے اور صورتِ حال سے آگاہ کیا، آپ کو اس پر بہت افسوس ہوا۔ آپ نے تجہیز و تکفین کے احکام بیان کر کے اپنے سامنے کفن ترتیب سے پہنایا اور نمازِ جنازہ پڑھائی، قبر تک ساتھ گئے، ناقص قبر کو دیکھ کر اور بھی افسوس ہوا، اسی وقت دل میں ایک مدرسہ قائم کرنے کا خیال آیا۔ گھر آئے اور پھر اپنے پیر و مرشد سید مولانا بدر الدین مجیبی صاحب کے مشورے سے ۱۲/ نومبر ۱۹۱۲ء کو 'مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ' کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا اور ایک کمیٹی تشکیل دی۔

اساتذہ

آپ نے تحصیل علم کے لیے جن علماء کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا، وہ سب علم دین کے بحر بیکراں تھے، مثلاً مولانا سید عبد اللہ قادری، مولانا محمد سہول بھاگلپوری، مولانا دیانت حسین اور ملک العلماء مولانا سید ظفر الدین بہاری (صاحب صحیح البہاری) وغیرہم۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کو عربی، فارسی، اردو اور انگریزی وغیرہ زبانوں پر کافی مہارت تھی۔

درس و تدریس

تحصیلِ علم کے بعد آپ ابتدا میں مدرسہ اسلامیہ اورنگ آباد ضلع گیا صوبۂ بہار میں عربی ادب اور حدیث کے استاد مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۶ء میں مادرِ علمی مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں تفسیر و حدیث کی تدریس کی مسند پر فائز ہوئے۔

۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۴ء تک مشہورِ زمانہ 'خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ' میں ماہرِ مخطوطات اور ریسرچ کیٹلاگ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

اسی طرح ۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۷ء تک 'رائل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ' میں اسی عہدے پر مامور ہوئے۔ اسی دوران رشتۂ ازدواج سے منسلک ہوئے۔

تقسیمِ ہند کے بعد ۱۹۴۷ء میں کلکتہ سے ہجرت کر کے اہل و عیال کے ساتھ کراچی (پاکستان) آئے، یہاں مختصر قیام کرنے کے بعد حیدر آباد (سندھ) منتقل ہوئے اور وہاں سکونت اختیار کی۔

آپ نے پاکستان آنے کے بعد غالباً باقاعدہ تصنیف و تالیف کے کام کا آغاز ۱۹۵۳ء میں شروع کیا۔ آپ کی تحریری کاوشیں پہلے پہل المکتبہ کراچی سے شائع ہونا شروع ہوئیں اور پھر حیدر آباد سندھ سے، الغرض تصنیف و تالیف کا یہ سلسلہ تادمِ آخر جاری رہا۔ اس دوران آپ نے مختلف موضوعات پر کُتب، رسائل اور مضامین قلم بند کیے۔

۱۹۵۹ء میں آپ ریڈیو پاکستان حیدر آباد سے وابستہ ہوئے، جہاں آپ نے محفل درسِ قرآن کا سلسلہ شروع کیا اور پانچ پاروں کی تفسیر پیش کی، جو عوام و خواص میں نہایت مقبول ہوئی۔

۱۹۶۵ء میں پراونشل لائبریری اور میوزیم کی بنیاد رکھی اور ۱۹۶۹ء تک اس سے وابستہ رہے۔ اسی (۱۹۶۵ء کے) عرصے میں حکومت پاکستان کی طرف سے 'جامعہ اسلامیہ بہاول پور' (سابقہ جامعہ عباسیہ) میں شیخ التصوف کی حیثیت سے مقرر کئے گئے، ابھی چھ ماہ ہی گزرے تھے کہ حکومتِ سندھ نے آپ کو واپس لائبریری بلوالیا، کیوں کہ لائبریری کے انتظامی معاملات بہت دگرگوں ہو رہے تھے۔ دسمبر ۱۹۶۹ء کو آپ نے لائبریری سے ریٹائرمنٹ لے لی۔

لائبریری سے سبکدوش ہونے کے بعد ۱۹۷۰ء میں مولانا مفتی محمد خلیل خان برکاتی رحمۃ اللہ علیہ آپ کو 'دار العلوم احسن البرکات' حیدر آباد میں بحیثیت 'شیخ الحدیث' لے گئے، جہاں آپ نے چار سال تک درسِ حدیث دیا۔

۱۹۷۴ء میں 'الجامعہ العلیمیہ الاسلامیہ' معروف بہ 'المرکز الاسلامی'، شمالی ناظم آباد کراچی تشریف لائے اور تاحیات ۱۹۸۸ء تک اسی ادارے سے وابستہ رہے۔ جامعہ میں تدریس کے علاوہ مسجد میں جمعہ، عیدین و دیگر محافل مقدسہ میں علمی خطبات دیے، جن کے مثبت اثرات آج بھی طلبہ اور عوام کے دلوں میں نقش ہیں۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ یہیں سے جاری ہونے والے انگریزی ماہنامے "دی منارٹ" کے ایڈیٹوریل بورڈ سے بھی منسلک رہے۔

۱۹۸۰ء کے اوائل میں تبلیغِ دین کے لیے آپ نائجیریا (افریقہ) تشریف لے گئے، جہاں مختلف اسلامی موضوعات پر لیکچر دیے اور دیگر مذاہب کی طرف سے اسلام پر کیے جانے والے اعتراضات کے نہایت مدلل اور سادہ انداز میں جواب دیے، شکوک وشبہات کو قلوب واذہان سے دور کیا، جس کے نتیجے میں کئی لوگوں نے آپ کے دستِ حق پرست پر اسلام قبول کیا اور ابدی سعادتوں کو حاصل کرنے والے بن گئے۔

۱۹۸۱ء میں گورنر سندھ نے آپ کو سندھ یونیورسٹی اور سنڈیکیٹ کا ممبر نامزد کیا۔

اولاد واحفاد

آپ کی دو صاحبزادیاں اور تین صاحبزادے تھے۔ صاحبزادوں کے نام یہ ہیں: سید محمد عبدالرحمن شمسی، سید محمد عبدالرب شمسی مرحوم اور سید محمد منور احمد شمسی مرحوم۔

تصنیف وتالیف

فاضل شمسی تحریر و تقریر دونوں میں صاحبِ کمال تھے، آپ نے جو لکھا وہ مقبول عوام وخواص ہوا۔ اب تک کی کوشش سے جن مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کُتب ورسائل اور مقالات کا معلوم ہو سکا ہے، اُنھیں ذیل میں الگ الگ عنوان کے تحت ذکر کیا جاتا ہے:

کُتب

ان میں قابلِ ذکر یہ ہیں:

۱۔ **انوارِ حدیث** (جو آپ کے ہاتھوں میں ہے)

۲۔ **اِیصالِ ثواب** (عقلی اور نقلی دلائل کا مجموعہ)

۳۔ **تنشیط الاذھان یعنی: تنقید حفظ الایمان** (تاریخی نام: 'اکتسابِ فیض'۱۳۷۴ھ)

۴۔ **صلوٰۃ وسلام** (درود وسلام کی برکات وفوائد)

۵۔ **عالمگیر نبوت** (عقیدۂ ختمِ نبوت پر قرآنی آیات، احادیث، عقلی دلائل اور منکرین کے شبہات کا مدلل رد)

۶۔ **فلسفۂ نماز** (نماز کی اہمیت، فضائل، برکات وفوائد)

۷۔ **وثیقۂ خلافت** (سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خلیفہ بلا فصل ہونے پر لاجواب تحریر)

۸۔ **تفسیرِ ہاشمی**، ۱۹۷۶ء کے ایک اشتہار میں یوں لکھا ہوا ہے کہ

”قرآن پاک کی اب تک جو تفاسیر متقدمین ومتأخرین نے لکھی ہیں، ان کی اِفادیت اپنی جگہ مسلم ہے، علامہ سید ہاشم فاضل شمسی نے موجودہ دور کے مسائل کے مطابق جدید انداز میں تفسیرِ قرآن کا آغاز کر دیا ہے، جس میں عقلی دلائل سے بھی بحث کی گئی ہے۔ ابتدائی پانچ پاروں کی تفسیر لکھی جا چکی ہے۔ پہلا پارہ عن قریب منظرِ عام پر آرہا ہے۔

ناشر اِدارہ تفہیمِ دین، حیدرآباد“۔

تاہم بہت تگ ودو کے بعد بھی یہی نہیں معلوم ہو سکا کہ یہ شائع بھی ہوئی تھی یا نہیں، ہم نے اس سلسلے میں خود کراچی سے حیدرآباد کا سفر کیا اور اس کے بارے میں معلوم کیا، تو 'کفِ افسوس ملنے' کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔

۹۔ بروز سے براز تک

اس کے اشتہار میں یوں لکھا ہوا ہے:

”جامعہ اسلامیہ بہاول پور کے سابق شیخ التصوف **علامہ سید محمد ہاشم فاضل شمسی**،

مرزا غلام احمد قادیانی غیر مسلم کے حالاتِ زندگی کی روشنی میں

دل چسپ کتاب رقم فرما رہے ہیں۔

ناشر اِدارہ تفہیمِ دین، حیدرآباد“۔

لیکن کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ آیا یہ مکمل بھی ہوئی تھی یا نہیں، واللہ المستعان۔

رسائل

آپ رحمۃ اللہ علیہ کے رسائل کے مضامین ہمہ جہت اور عصری تقاضوں کے مطابق ہوا کرتے تھے، آپ نے اپنے زمانے میں اُٹھنے والے گمراہ کن نظریات کے خلاف مختلف رسائل

تحریر فرمائے، جن میں اکثر کا سببِ تالیف منکرینِ حدیث یعنی: فرقۂ اہلِ قرآن کے اشکالات اور تجددات تھے، ان رسائل میں ان تمام کا مدلل جواب دیا گیا ہے۔ اسی طرح چند رسائل تقابلِ ادیان پر بھی مشتمل ہیں۔ ہم ذیل میں اب تک میسر آنے والے رسائل کا ذکر کرتے ہیں:

۱۔ اسلام ایک عملی مذہب ہے

۲۔ اسلام عقل اور تجربہ کی روشنی میں

۳۔ اسلام میں دستور کی تلاش

۴۔ اسلام میں نظامِ اِطاعت

۵۔ اقلیت واکثریت

۶۔ انسان اور کائنات (راقم کو میسر نہ ہوسکا)

۷۔ انسانیت کے لیے آخری اور ابدی پیغامِ ہدایت

۸۔ بیمار قوم اور اُس کا علاج (راقم کو میسر نہ ہوسکا)

۹۔ تلاشِ حق

۱۰۔ توحید یا تثلیث (نصاریٰ کے نظریۂ تثلیث کا رد)

۱۱۔ ثواب وعذاب

۱۲۔ جہاد وقتال، غلام اور کنیزیں

۱۳۔ روسی راکٹ قرآن کی نظر میں (راقم کو میسر نہ ہوسکا)

۱۴۔ سکون کا راستہ (راقم کو میسر نہ ہوسکا)

۱۵۔ شیطان کے فریب

۱۶۔ عیدِ قربان اور مسلمان

۱۷۔ فَترت و خِتام

۱۸۔ قرآنی قوانین اور اِلہامی فیصلے

۱۹۔ گناہ و تقدیر (راقم کو میسر نہ ہو سکا)

مضامین

فاضل شمسی رحمۃ اللہ علیہ کے مضامین میں بھی تنوع پایا جاتا ہے، آپ نے اعتقادیات، تفسیر، تصوف و صوفیہ اور جدید مسائل پر حسبِ ضرورت مختصر و طویل تحریریں قلم بند کیں، جو مختلف سُنی رسائل میں شائع ہوئیں۔ اس سلسلے میں 'ترجمانِ اہل سنت' کراچی اور 'ماہنامہ تاج' کراچی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ہمیں جو مضامین میسر آسکے ہیں، ہم اُن کے نام موضوعاتی اعتبار سے ذیل میں لکھتے ہیں:

اعتقادیات وسیرت

۔مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہ کی تشریح

۔نبی کی زبان

۔کیا نبی کے لیے معجزہ ضروری ہے؟ (ایک تحقیقی بحث)

۔صلوٰۃ وسلام

۔قبائل کو شیر و شکر کرنے والا "محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم"

۔دہریت اور اس کی ایڈیالوجی (راقم کو میسر نہ ہو سکا)

عبادات واخلاق

۔زکوٰۃ اور اس کے مصارف

۔جمعۃ الوداع

۔ آداب واخلاق

۔مشاورت

۔رازداری

۔اِصلاح وتعمیر

۔اکلِ حلال

تفسیر

۔ قرآن کریم کا احترام

۔ تشریح سورۂ فاتحہ

۔ تشریح سورۂ نبأ

۔ تشریح سورۂ نازعات

تصوف وصوفیہ

۔ تاج الاولیاء رحمۃ اللہ علیہ

۔تصورِ شیخ

۔جذب، سکر، استغراق

۔جبہ ودستار کے محافظ (دارالعلوم احسن البرکات کی ایک تقریر)

جدید مسائل

۔لاؤڈاسپیکر کا استعمال؟(جواز کا بیان)

۔ آزاد جنسی اختلاط

عرض: قارئین میں سے اگر کسی کے پاس شمسی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کُتب ہوں، تو رابطہ فرمائیں۔

امام و خطابت

فاضل شمسی کم و بیش پچیس سال (۲۵) حیدر آباد کی نئ عید گاہ کے خطیب و امام رہے۔ اس دوران ہزاروں لوگ آپ کی تقریر کے ذریعے علوم دینیہ سے مستفیض ہوئے۔ آپ کی تبحرِ علمی کی مثالیں حیدر آباد (سندھ) کے ان جلسوں میں بھی دیکھنے میں آئیں، جن کا انعقاد مسیحی مشن کے جواب میں "تعلیم فروغ دین" کے تحت کیا جاتا تھا، بے شمار لوگ سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت ان پر سوالات کی یلغار کاغذ پر لکھ کر کرتے اور آپ بے تکلّفی سے نہایت جامعہ اور مختصر انداز سے ان کا جواب دیتے جاتے اور کاغذ ایک طرف رکھتے جاتے۔

جن دنوں کراچی تشریف لائے تو جامع مسجد المرکز الاسلامی میں جمعہ کے دن ان کی تقریر مختلف عنوان پر خطبہ سے قبل ہوئی تھی۔ پھر اپنے عربی خطبہ میں مضمون سے متعلق خصوصی نکات کو قرآن و حدیث کی اسناد کے ساتھ عربی میں پیش کرتے اور اس برجستگی اور عام فہم انداز میں کہ دونوں زبانوں سے واقف طلبہ اور حاضرین لطف اندوز اور مستفید ہوتے تھے[۱۷]۔ راقمِ حروف کو اچھی طرح یاد ہے کہ فاضل شمسی کے انتقال سے قبل والد گرامی ہمیں اکثر نمازِ جمعہ کی ادائیگی کے لیے بڑی مسجد[۱۸] ہی لے جایا کرتے تھے۔

۱۷؎ سید محمد ہاشم فاضل شمسی، 'انوار حدیث'، ورلڈ فیڈریشن آف اسلامک مشنز کراچی، ۱۹۸۵ء، ص ۱۳۔

۱۸؎ شمالی ناظم آباد بلاک 'بی' کراچی میں کئی مساجد ہیں، بڑی مسجد ہم 'المرکز الاسلامی' کو کہتے تھے، عوام وخواص میں اسے 'المرکز' کہا جاتا ہے۔ تاہم جب ہم نے سنگِ بنیاد پر اس کا نام دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ جامع مسجد 'الھلال' ہے، جس کا سنگِ بنیاد سفیرِ عراق سید عبد القادر گیلانی (برادر پیر سید طاہر علاء الدین گیلانی رحمۃ اللہ علیہما) نے رکھا تھا۔ محقق

اربابِ علم و دانش کی نظر میں

علامہ عبد الحکیم شرف قادری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"راقم الحروف ایک دفعہ المرکز الاسلامی میں آپ کی زیارت کے لیے حاضر ہوا۔ آپ نے ایسی بزرگانہ شفقت سے نوازا کہ آج تک اس کا اثر دل میں محسوس ہوتا ہے۔ گھر میں اس وقت آپ تنہا تھے، خود چائے بنا کر لائے اور مہمان نوازی کا گہرا نقش دل پر ثبت فرما گئے"[19]۔

پروفیسر ڈاکٹر علامہ سید حامد حسن بلگرامی رقمطراز ہیں:

"مجھے مولانا سے شرف نیاز اس زمانہ میں حاصل ہوا جب مجھے جامعہ اسلامیہ بہاول پور کی تشکیل کا کام سپرد ہوا اور حضرت مولانا شمسی کو جامعہ میں بطور صدر شعبہ تصوّف واخلاق کی دعوت حکومت کی جانب سے پیش کرنے کا موقع ملا۔ حضرت مولانا سے واقف حضرات جانتے ہیں کہ جب بھی انھیں کسی میلاد شریف میں تقریر کی دعوت دی جاتی ہے تو وہ اپنے سامعین سے خود دریافت فرماتے ہیں کہ کس عنوان پر کچھ سننا پسند فرمائیں گے۔ پھر اس عنوان پر قرآن وحدیث کی روشنی میں اسناد کے ساتھ جس بے تکلّفی اور قادر کلامی سے وہ تقریر فرماتے ہیں وہ انھیں کا حصّہ ہے"[20]۔

محترم سید منیر احمد (حیدر آباد، سندھ) کا کہنا ہے:

"فاضل شمسی رحمۃ اللہ علیہ کو لطیف آباد (حیدر آباد) میں عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریبات کے انتظامات کے سلسلے میں بڑی فکر رہتی تھی۔ ایک مرتبہ مالی وسائل کی کمی کی

۱۹؎ 'عظمتوں کے پاسبان'، ص ۲۸۳۔

۲۰؎ 'انوار حدیث'، ص ۱۳۔

وجہ سے آپ نے اپنے احباب کے سامنے یہ پیش کش رکھی کہ اگر وسائل میسر نہ آئیں تو پریشان نہ ہوں، میرا بنگلہ فروخت کر کے عید میلاد النبی ﷺ کی تقریبات ضرور منعقد کرنے کا اہتمام کرلیں۔ بفضلہ تعالیٰ مالی وسائل کا بندوبست ہو گیا اور عید میلاد النبی ﷺ کی تقریبات میں کسی قسم کا تعطل نہیں ہوا"[۲۱]۔

وصال

آپ کا وصال یکم محرم الحرام ۱۴۰۹ھ مطابق ۱۵/ اگست ۱۹۸۸ء بروز پیر کراچی میں ہوا۔ مفتی قاری محبوب رضا خان رضوی (سابق رئیس دار الافتاء دار العلوم امجدیہ کراچی) نے المرکز الاسلامی شمالی ناظم آباد میں نمازِ جنازہ پڑھائی، پھر وہاں سے آپ کو حیدر آباد سندھ لایا گیا، جہاں لطیف آباد نمبر ۹ کے قبرستان میں تدفین کی گئی[۲۲]۔

إنّا لله وإنّا إليه راجعون.

راقمِ حروف اپنے چند احباب کے ساتھ ۳۱/ جولائی ۲۰۱۷ء بروز پیر صبح کے وقت آپ کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے حاضر ہوا تھا۔ قبرستان میں اگر پٹرول پمپ سے قریب والے دروازے سے داخل ہوا جائے، تو چند قدم چلنے کے بعد بائیں جانب آپ کی قبر واقع ہے۔ قبر پر ایک کتبہ لگا ہوا ہے، جس پر جلی حروف میں لکھا ہے:

۲۱۔ روزنامہ 'خفیہ' حیدرآباد، ۹/ مئی ۱۹۹۷ء۔

۲۲۔ سید محمد زین العابدین راشدی، 'انوارِ علمائے اہلسنت سندھ'، ص ۱۰۲۶۔

نوٹ: اطلاعات کے مطابق حیدرآباد سندھ میں بمقام 'عید گاہ' دوبارہ آپ کی نمازِ جنازہ ادا کی گئی اور اس کے بعد تدفین کی گئی۔ محقق

مزارِ مبارک

قاضیِ شہر، امام عیدین رانی باغ حیدرآباد

شیخ الحدیث شیخ التصوف حضرت علامہ

سید محمد ہاشم فاضل شمسی رحمۃ اللہ علیہ

یومِ وصال: یکم محرم الحرام ۱۴۰۹ھ مطابق ۱۵/ اگست ۱۹۸۸ء بروز پیر

کوکبِ چرخِ حکمت ودانش راز دارِ مقامِ سرِ مستی
جس نے پھیلائی علم کی کرنیں جس نے ہر گاہ بات کی حق کی
نام جس کا محمد ہاشم تھا اور مشہور 'فاضل شمسیؔ'
ماہِ اول کی جب ہوئی اول چھا گئی یک بہ یک فضا غم کی
لے کر چلی گئی قضا دیکھو! دستِ علم و عمل سے وہ ہستی
قدرؔ، تاریخ اشکِ غم سے لکھ بر سنِ عیسوی، سنِ ہجری
''آہ شیخ الحدیث شب بیدار'' ''ہدیہ نایاب فاضلِ شمسی''

''۱۴۰۹ھ'' ''۱۹۸۸ء''

نتیجۂ فکر: قدیر احمد قدر القادری عفی عنہ

تنصیبِ کتبہ وتزیینِ تُربت

مؤرخہ ۱۷/ ربیع الثانی ۱۴۳۷ھ مطابق ۲۹/ جنوری ۲۰۱۶ء

حصولِ سعادت: علامہ شمسی یادگار کمیٹی حیدرآباد

❁ ..... ❁ ..... ❁ ..... ❁

مختصر تذکرہ ڈاکٹر سید حامد حسن بلگرامی رحمۃ اللہ علیہ

نام ونسب

آپ کا نام سید حامد حسن بلگرامی بن سید محمود حسن بلگرامی ہے۔

پیدائش

آپ ۲/ اگست ۱۹۰۸ء بمطابق ۱۳۲۶ھ کو بھارت کے علاقہ بلگرام الٰہ آباد (اُترپردیش) میں پیدا ہوئے۔

تعلیم وتربیت

آپ نے یتیمی کے عالم میں سفر تعلیم کا آغاز کیا۔ الٰہ آباد یونیورسٹی بھارت، سے بی۔اے اور ایم۔اے کی ڈگریاں حاصل کیں اور یہیں سے اردو میں علامہ اقبال پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

خدمات

۱۹۴۸ء میں پاکستان منتقل ہوئے اور کچھ ہی روز قیام کے بعد اسی سال لندن یونیورسٹی (برطانیہ) میں پاکستان کی زبان، تہذیب اور ثقافت کے لیکچرار مقرر ہوئے اور پانچ سال خدمات انجام دینے کے بعد ۱۹۵۳ء میں وطن واپس آئے۔ ۱۹۶۰ء میں آپ کو محکمۂ اوقاف پنجاب کی جانب سے ائمہ وخطباء مساجد کی تربیت کے لیے قائم کردہ "علما اکیڈمی" میں ڈائریکٹر مقرر کیا گیا۔ اس کے بعد بہاول پور کی "جامعہ اسلامیہ" (سابقہ "جامعہ عباسیہ") میں پانچ سال تک وائس چانسلر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ کچھ عرصہ ملک عبد العزیز یونیورسٹی جدہ میں اسلامی تعلیمات کے متعلق پروفیسر رہے۔ اس کے بعد کچھ عرصہ

مرکز تعلیمات اسلامی کے مشیر کی حیثیت سے کام کیا۔ سلسلہ چشتیہ کے نامور صوفی بزرگ باباعبید اللہ خان درانی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے۔

تصنیفات

انگریزی اور اردو میں بہت سی کتب تحریر کیں جن میں درج ذیل قابلِ ذکر ہیں:

۱۔ ''تفسیر فیوض القرآن'' (اردو) ۲ جلدیں

۲۔ ''نور مبین''، (سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے انوار و تجلیات و کمالات فضائل و معجزات کا بیان)

۳۔ ''اسلامی نظریہ تعلیم''،

۴۔ ''درود تاج'' (ترجمہ و تشریح)،

۵۔ ''سائبانِ رحمت''،

۶۔ ''تنویر سحر''،

۷۔ ''ندائے حرم''

اور ۸۔ زادِ راہ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

وصال

آپ کا وصال ۹۲ سال کی عمر میں ۲۸/ جنوری، ۲۰۰۱ بمطابق ۲/ ذیقعدہ ۱۴۲۱ھ بروز اتوار کراچی میں ہوا اور پاپوش نگر قبرستان ناظم آباد کراچی میں آسودۂ خاک ہوئے[۲۳]۔

❁ ..... ❁ ..... ❁ ..... ❁

۲۳؎ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: 'انوارِ علماِ اہلسنت سندھ'، ص ۲۰۲۔۲۰۶۔

قولہ تعالیٰ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی○اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی○

[النجم ۵۳: (۳۔۴)]

اَللّٰھُمَّ

صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ مَّعْدِنِ الْجُوْدِ وَالْکَرَمْ

مَنْبَعِ الْعِلْمِ والْحِکَمِ وَآلِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مقدمہ بار دوم

از ڈاکٹر سید حامد حسن بلگرامی (رحمۃ اللہ علیہ)

(سابق وائس چانسلر جامعہ اسلامیہ بہاول پور)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلَی نِعَمِہِ الْوَافِرَۃِ، وَرَحْمَاتِہِ الذَّاخِرَۃِ

وَالصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ عَلَی خَیْرِ الدُّنْیَا وَالْآخِرَۃِ وَعَلَی ذُرِّیَّاتِہِ الطَّاھِرَۃِ

اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ جب بھی دین متین میں کسی رخنہ اندازی کی کوشش ہوتی ہے تو اس کے سدِّباب کے لیے کسی عالمِ محقّق کے قلم سے کوئی ایسی کتاب منظر عام پر آجاتی ہے جو نہ صرف اس فتنہ سے اُمّت کو باخبر کرتی ہے، بلکہ اس سے پیدا ہونے والے ہر شک، تذبذب اور واہمہ سے اُمّتِ مسلمہ کو نکال کر ان کے قلوب کو نُورِ ایمان سے منوّر کر دیتی ہے اور پھر محققین علمائے راسخین کی ایک جماعت ایسے فتنوں کی بیخ کنی کے لیے سرگرم عمل ہو جاتی ہے۔

حضرت مولانا سیّد محمد ہاشم فاضل شمسی مدّ ظلہ العالیٰ کی یہ کتاب ''انوارِ حدیث'' ایک ایسی ہی پُر فیض اور محققانہ تصنیف ہے۔ جو ایک مقالہ کی صورت میں تقریباً تیس سال قبل پہلی بار شائع ہوئی تھی۔ جب فتنۂ انکارِ حدیث اور پرویزیت نے سر نکالا تھا اور کلمہ: لَآ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ کو گویا مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ سے الگ کرنے کی ناپاک کوشش کی تھی۔ حضرت محترم نے حجیّت حدیث پر بروقت ایک مقالہ لکھ کر نہ صرف اس فتنۂ انکارِ حدیث کے سدِباب کی طرف ایک اہم تحریک کا آغاز فرمایا بلکہ اس فتنہ سے متعلق تمام امور سے بھی اُمّتِ مسلمہ کو آگاہ کیا جو بالعموم ایسی بے راہ روی کا سبب بنتے ہیں اور جن سے باخبر رہنا ہمارا فرض اوّلین ہے۔

آج بحمد اللہ حجیّتِ حدیث پر علمائے کرام کی متعدد مستند تصانیف شائع ہو چکی ہیں جن میں حضرت محترم مناظر احسن گیلانی کی "تدوینِ حدیث" اور حضرت مخدوم و محترم پیر کرم شاہ صاحب کی "سنّتِ خیر الانام" خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ بے شمار مضامین بھی اس موضوع پر شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان میں حافظ محمد ایّوب کی تقاریر اور رسالہ جو شائع ہو چکے ہیں، ایک عظیم علمی سرمایہ ہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ حضرت مولانا سید محمد ہاشم فاضل شمسی صاحب کا یہ مقالہ اب "الوفاق العالمي للدعوة الإسلامية" کی طرف سے کتابی صورت میں شائع ہو رہا ہے۔ حضرت محترم کی یہ کتاب دراصل آج بھی اسی قدر اپنے موضوع پر مستند اور مفید ہے جیسی آج سے تیس سال قبل تھی بلکہ حق یہ ہے کہ حجیّتِ حدیث اور فتنہ انکارِ حدیث کو سمجھنے کے لیے یہ ایک بنیادی کتاب ہے۔ اللہ تعالیٰ "المرکز الاسلامی" کے مخلص کارکنوں کو زیادہ سے زیادہ ایسی مستند اور پُر فیض تصانیف کو عام کرنے کی سعادت سے نوازے کہ انوارِ علم و عرفان کی تجلّیات عام ہوتی رہیں، کتاب "انوارِ حدیث" ہمارے سامنے ہے۔

جہاں کتاب کی نوعیت کا تعلّق حضور سرور کائنات ﷺ کے اقوال، اعمال اور احوال سے ہو، اور ان کو عام کرنے کی سعادت کا شرف ایک عالم متبحر صاحبِ قلب و نظر کو عطا ہو، ہو وہاں مجھ جیسے عاجز کا قلم اٹھانا ایک جسارت کے مترادف ہے خواہ وہ تعمیلِ حکم ہی میں کیوں نہ ہو، لیکن یہ جسارت صرف اور صرف اس امید پر کر رہا ہوں کہ شاید سرورِ کائنات شفیع المذنبین کے دربار بیکس پناہ کے خاکروبوں میں ایک عاجز کا بھی شمار ہو جائے اور اُس خاکِ پُر نور کا کوئی ذرّہ میرے قلبِ سیاہ کو بھی نورِ ایمان سے منور فرمادے۔ صَلَّی اللہُ عَلٰی نَبِیِّنَا صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ۔

اس بابرکت کتاب ''انوارِ حدیث'' کے متعلّق آپ بہت کچھ اس مختصر کتاب سے خود ہی استفادہ فرمائیں گے۔ پھر حضرت مولانا نے دراصل کتاب کے آخر میں ''خلاصۂ مضمون'' کے عنوان سے ایک باب کا اضافہ کرکے اس کتاب کے لیے مقدّمہ یا پیش لفظ کی ضرورت کو خود ہی پُورا فرمادیا ہے اور اجمالاً ان تمام موضوعات کا ذکر کر دیا ہے جو اس کتاب میں زیر بحث آئے ہیں۔

مثلاً کسی زبان کی نفسیات اور بالخصوص عربی زبان کی خصوصیت۔ متکلم ومترجم اور اصل کتاب اور ترجمہ کا نفسیاتی فرق۔ جمع قرآن اور حدیث کے طریقے۔ حدیثوں کی کتابت اور اشاعت اور ان کا تسلسل۔ صحاح ستہ سے قبل نقد وانتخابِ روایت کے اُصول اور اسناد۔ حدیث کے تحقیق کے قواعد۔ متنِ حدیث سے استفادہ کے طریقے۔ اصلاح حدیث کی تشریح۔ کتاب اور سنّت کا باہم ربط اور آخر میں فہم قرآنی کے اصولوں پر سیر حاصل بحث فرماکر نہایت وضاحت سے یہ بات ذہن نشین فرمادی ہے کہ جب تک کسی شخص کو ان اُمور سے کماحقہ آگاہی نہ ہو، اُس کا فنِ حدیث یا تدوینِ حدیث یا فہم قرآنی پر تنقید یا تبصرہ کی جسارت کرنا اپنی نااہلی کا ثبوت دینا ہے۔

فاضل مصنّف کے دردمند قلم نے مختلف ابواب میں یہ مختلف مباحث نہایت شرح وبسط کے ساتھ بیان فرمائے ہیں اور احادیث مبارکہ کی اہمیت کے ساتھ روایت کے تسلسل پر بالخصوص زور دیا ہے تاکہ احادیث کی صداقت پر مہرِ تواتر بھی شاہد رہے۔ ساتھ ہی احادیث مبارکہ یا فنِ حدیث پر قلم اُٹھانے کے لیے جس بصیرت اور جن علوم کا حصول ضروری ہے اس کی طرف بھی اپنے قارئین کی توجہ مبذول فرمائی ہے اور حجیتِ حدیث اور تدوینِ حدیث سے متعلّق متعدّد نکات سے آگاہی بخشی ہے۔

حضرت محترم مولانا شمسی صاحب نے بڑی خوبی سے یہ نکتہ واضح فرمایا ہے کہ احادیث مبارکہ ہی کی روشنی میں قرآنی فہم اور فقہِ اسلام کی تدوین ممکن ہے۔ احادیث ہی ایمان اور اسلام کی درمیانی کڑی ہیں۔ یہی لَآاِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کی تفسیریں ہیں۔ انھیں کے ذریعہ علم کے ساتھ حکمت کا مفہوم سمجھ میں آتا ہے۔ یہی ''لَقَدْ جَآءَکُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ وَّکِتَابٌ مُّبِیْن'' کی حقانیت کو واضح کرتی ہیں۔ اسی نور مبین ﷺ کی روشنی میں کتابِ مبین اور دینِ متین کے فیوض و برکات میسّر آتے ہیں۔ قرآنِ حکیم کے ہر نکتہ کا ترجمان انھی ﷺ کا قولِ مبارکہ، عمل مقدس، اِنھی ﷺ کی خاموشی، انھی ﷺ کا تبسّم اور انھی ﷺ کی جبینِ مبارک کی شکن ہے۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ لامحدود کو لامحدود کے وسیلے سے پایا جاسکتا ہے۔ اللہ رب العزّت کی فہم اور یافت کا ذریعہ اس کا کلام ہی ہو سکتا ہے، جس کی تفسیر خود صاحبِ قرآن نورِ مبین سرورِ کائنات ﷺ خود ہیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جو کلمۂ طیبہ کا لامنقسم رکنِ اعظم ہے جس کو نظر انداز کرنا، کلمہ سے، ایمان سے، اسلام سے محرومی ہو گا۔

''انوارِ حدیث'' کا ایک سرسری مطالعہ بھی اس امر کو واضح کر دیتا ہے کہ اس کے مصنّف کا قلب نورِ ایمان و نورِ عرفان سے اور اس کا ذہن نورِ علم و نورِ فراست سے منوّر ہے۔ کیوں نہ ہو، یہ نتیجہ ہے اس محبّت کا جو حضرت مولانا کو حضور سرورِ عالم ﷺ سے ہے۔ اور ثمرہ ہے اس فیض کا جو انھیں اپنے جیّد بزرگوں سے وراثتاً ملا ہے۔ ان بزرگ ہستیوں میں حضرت مخدوم فرید الدین طویلہ بخش رحمۃ اللہ علیہ، حضرت محترم علی ابن شہاب ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت قطب الدین مودود چشتی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت خواجہ اسد اللہ شاہ بھکری رحمۃ اللہ علیہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ پھر تحصیل علم کے لیے حضرت مولانا نے جن علماء کے سامنے زانوئے

ادب تہہ کیا، وہ سب علم دین کے بحرِ بیکراں تھے، مثلاً سید شاہ عبید اللہ صاحب قادری، حضرت مولانا محمد سہول صاحب بھاگلپوری، حضرت مولانا دیانت حسین صاحب، ملک العلماء حضرت مولانا ظفر الدین صاحب شاگرد و خلیفہ حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ حضرت مولانا شمسی صاحب کی شخصیت، ظاہر و باطن، قلب و نظر، علم و عرفان کا ایک حسین سنگم بن گئی ہے۔

یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ حضرت مولانا کے جدِّ اعلیٰ خواجہ سید اسد اللہ شاہ بھکری گنج نشیں رحمۃ اللہ علیہ سندھ تشریف لائے اور ٹھٹہ میں قیام فرمایا۔ آج اسی صوبۂ سندھ سے علم و عرفان کی روشنی مولانا محمد فاضل شمسی کے زبان و قلم سے بحمد اللہ پھیل رہی ہے۔

جیّد اساتذہ کی تعلیم و تربیت نے حضرت مولانا میں علم کا ذوق، دین کی فہم اور مطالعۂ کتب کا ایک شوق پیدا کر دیا جس کی تشفّی کے اسباب کچھ یوں پیدا کئے گئے کہ آپ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں تفسیر و حدیث کے استاد مقرر ہوئے اور پھر دنیا کی ایک مشہور ترین لائبریری "خدا بخش اورینٹل لائبریری" میں ماہر مخطوطات وریسرچ کیٹیلاگر کے علمی عہدہ پر متعین رہے اور پاکستان آنے کے بعد بھی ان کو سندھ کی صوبائی لائبریری کی خدمات میسّر ہو گئیں، جہاں ان کا کام نہ صرف ایک علمی کتب خانہ کا قیام تھا بلکہ ان کے اصل ذوق کی تشفی لوگوں کی اصل کتاب کی رہنمائی میں ظاہر ہوا کرتی۔

مجھے مولانا سے شرف نیاز اس زمانہ میں حاصل ہوا، جب مجھے جامعہ اسلامیہ بہاول پور کی تشکیل کا کام سپرد ہوا اور حضرت مولانا شمسی کو جامعہ میں بطور صدر شعبۂ تصوّف واخلاق کی دعوت حکومت کی جانب سے پیش کرنے کا موقع ملا۔

حضرت مولانا نے ہماری استدعا پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے طلباء کے ساتھ اقامت گاہ میں رہنا قبول فرمایا۔ ادارے کی غرض یہ تھی کہ حضرت مولانا کی ذاتی خوبیوں سے جس میں علم کے ساتھ انکسار، تواضع، ایثار، حلم اور محبّت کی فراوانی ہے طلباء کو اس سے متاثر ہونے کا موقع ملے حضرت مولانا کے اقامت گاہ میں قیام کے بعد یہ اندازہ ہوا کہ طلباء کو ان سے کس درجہ لگاؤ پیدا ہو گیا ہے اور علوم دینیہ تفسیر، حدیث، علم الکلام، فقہ، تقابل ادیان، ادب ہر شعبہ سے متعلّق کتب پر ان کو کتنا عبور ہے۔ جامعہ کے شہادت عالمیہ اور تخصص (B.A, M.A) کے طلباء اپنے اپنے مضامین کی کتب لے کر ان کے پاس حاضر ہوتے اور وہ بے تکلّف ان کی مشکلات حل کرتے رہے۔ ہر چند اس کا اثر ان کی صحت پر پڑ رہا تھا لیکن کبھی کوئی حرفِ شکایت زبان پر نہ آیا۔

مولانا کے تبحّرِ علمی کی ایسی ہی مثالیں حیدرآباد کے ان جلسوں میں دیکھنے میں آئیں جن کا انعقاد مسیحی مشن کے جواب میں "تعلیم فروغ دین" کے تحت کیا جاتا ہے، بے شمار لوگ سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت ان پر سوالات کی یلغار کاغذ پر لکھ کر کرتے اور حضرت مولانا بے تکلّفی سے نہایت جامعہ اور مختصر انداز سے ان کا جواب دیتے جاتے اور کاغذ پھینکتے جاتے۔

حضرت مولانا سے واقف حضرات جانتے ہیں کہ جب بھی انھیں کسی میلاد شریف میں تقریر کی دعوت دی جاتی ہے تو وہ اپنے سامعین سے خود دریافت فرماتے ہیں کہ کس عنوان پر کچھ سننا پسند فرمائیں گے۔ پھر اس عنوان پر قرآن و حدیث کی روشنی میں اسناد کے ساتھ جس بے تکلّفی اور قادر کلامی سے وہ تقریر فرماتے ہیں وہ انہیں کا حصّہ ہے۔ آج بھی جامع مسجد المرکز الاسلامی میں جمعہ کے دن ان کی تقریر مختلف عنوان پر خطبہ سے قبل ہوتی ہے۔ پھر اپنے عربی خطبہ میں مضمون سے متعلق خصوصی نکات کو قرآن و حدیث کی اسناد کے

ساتھ عربی میں پیش کرتے ہیں اور اس برجستگی اور عام فہم انداز میں کہ دونوں زبانوں سے واقف طلباء اور حاضرین لطف اندوز اور مستفید ہوتے ہیں۔ اللہ ربّ العزّت انہیں زیادہ سے زیادہ دین اسلام کی اور وفاق العالمی للدعوۃ الاسلامیہ کی خدمت کے لیے صحت وعافیت سے رکھے۔ حضرت مولانا کے متعلق یہ چند حقائق پیش کرنے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کے اصل موضوع کے متعلق بھی چند تشریحات اور وضاحتوں کا اضافہ کیا جائے جو کتاب کی فہم میں معاون ہوں۔

دورِ حاضر علوم عقلیہ، ایجادات، تسخیرِ کائنات کا دور ہے مذہبی افکار کو بھی اس کسوٹی پر جانچا اور پرکھا جاتا ہے۔ اس عمل کے نتیجہ میں دنیا مذاہب کے بجائے اپنے خود ساختہ افکار کے تحت تقسیم ہوگئی ہے۔ صرف مسلمان اور دنیائے اسلام ہی اپنے ایمان اور دین اسلام کے واسطے سے بطور جماعت باقی ہے۔ ہر ممکن فتنہ ان کی انفرادیت اور اسلامی شعور کو ختم کرنے کے درپے ہے، کبھی یہ تحریک صلیبی جنگوں کی صورت میں تھی، اب یہ جنگ قلم اور ثقافت وسیاست کے زہریلی گیسوں سے لڑی جارہی ہے۔ صداقتِ دین کے متعلّق نوجوانوں میں شبہہ پیدا کرنا، ان کے اختلافات کو ہوا دینا عام ہوگیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ خود ان فتنوں سے متاثّر مسلمان اپنی کم علمی کے باعث ایسے اعتراض کرنے لگے ہیں جن کا مقصد بھی دین کی حقانیت اور اس کی ترتیب و تنظیم میں شبہہ پیدا کرنا ہے۔ گذشتہ ربع صدی سے اقتصادی کشمکش نے ابھی اس میں اضافے کر دیے ہیں اور اب یہ فتنے کچھ ایسی سمت سے اُٹھ رہے ہیں کہ بظاہر ان پر فتنہ کا دھوکہ بھی نہیں ہوتا لیکن یہ انتہائی مہلک ہیں کیونکہ ان کی آماجگاہ خود ''ایمان'' اور ''نورِ ایمان'' ہے۔ اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں البتہ فہم دین سے متعلق چند بنیادی امور کا ذکر ضروری ہے۔

مسلمان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی دو اجزاء سے عبارت ہے۔ ایک کا نام ایمان ہے اور دوسرے کا اسلام اور ان کے مجموعے ہی کو 'اسلام' کہتے ہیں۔ ایمان اس کو کہتے ہیں جس پر بلا دیکھے اللہ کے حکم کے تحت ایک صادق القول کے باور پر باور کر کے زبان سے اقرار اور قلب سے اس کی تصدیق کی جائے۔ یہاں عقل معاش کو صرف اس قدر دخل ہے کہ وہ کائنات کے نظام وحدت کو دیکھے اور یہ جان لے کہ اس کا پیدا کرنے والا اور اس کارخانے کو چلانے والا بھی ایک یکتا و یگانہ ہے جس کا نہ کوئی ہمسر ہے نہ شریک، اس کے ساتھ وہ یہ بھی سمجھ لے کہ جس ہستی کے ذریعہ یہ پیغام پہنچایا جارہا ہے، وہ اپنی جگہ بہر صورت منفرد اور اللہ کی برگزیدہ اور منتخب ہے۔ اس کے بعد جن چیزوں پر بھی ایمان لانا ہے وہ نہ تو نظریاتی ہیں نہ عقل سے سمجھی جاسکتی ہیں فرشتے، جنت، دوزخ، انبیاء کا تسلسل اور ان کی تعلیمی وحدت، مسئلہ قضا و قدر، موت کے بعد زندہ کیا جانا، حشر نشر سب اس میں شامل ہیں۔ ایمان کے لیے مسلمان کو ''یُومِنُونَ بِالْغَیْبِ'' کا خوگر ہونا پڑتا ہے۔ اللہ کی وحدانیت رسول کی رسالت پر بیک وقت ایمان لا کر گویا وہ ان سب اُمور کی تصدیق کرتا ہے جو اسے رسول کے واسطے سے پہنچے، خواہ کتاب سے یا اُن ﷺ کے فرمان و عمل سے۔ یہ بات بہت اہم ہے۔ رسول ﷺ کا ہر فعل اللہ ہی کے حکم اور امر کے تابع ہے گویا آپ ﷺ قرآنِ حکیم یا فرمانِ باری تعالیٰ کی عملی تفسیر ہیں۔ قرآن اگر نظریہ ہے تو عملِ رسول ﷺ اسوۂ حسنہ اس کی حکمت یا عملی صورت۔ اسی لیے احادیث مبارکہ میں جب ''ایمان'' کا ذکر آتا ہے تو انھیں اُمور کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے جن کا تعلق اعتقادات سے ہے اور جب ''اسلام'' کے لفظ کی تشریح کی جاتی ہے تو اس کے ستون کلمہ، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کو قرار دیا جاتا ہے جو ایمان کی گویا ظاہری

صورتیں ہیں گویا ایک ہی حقیقت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن۔ اللہ اگر نظر نہیں آتا تو رسول ﷺ تو نظر آتا ہے۔رَسُوْلُ اللّٰہِ ہی سے اللہ کو پانا اور سمجھنا ہے۔

اگر یہ بات ہمارے پیش نظر رہے تو ہر اس فتنہ سے ہم محفوظ رہیں گے جو محض عقل معاش کو اساس بنا کر اپنا سر نکالتا ہے۔ اسلام میں عقل معاش کے ساتھ عقل معاد بھی ضروری ہے۔ جب قرآن: اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ اَفَلَا تَتَفَکَّرُوْنَ۔ کی دعوت دیتا ہے تو دراصل وہ عقل کُل یعنی عقل معاش اور معاد دونوں کی طرف ہی متوجہ کرتا ہے۔ جس طرح عقل معاش کو ترقی دینے میں انسان کو برسوں کی کاوشوں کو دخل ہے اس طرح عقلِ معاد کو فروغ دینے کے لیے اس سے بھی زیادہ جدوجہد کی ضرورت ہے اور اسی ضرورت کی اہمیت اور تکمیل کے لیے انبیاء علیہم السّلام تشریف لاتے رہے یہاں تک کہ اس کی تکمیل نبوت کی سطح پر مکمل ہوئی اور نبی آخر ﷺ کے بعد آپ کے متبعین کو آپ کے پیغام اور تعلیمات کو عام کرنے کا کام سپرد ہوا، اور دنیا نے دیکھ لیا کہ خود صحابۂ کرام، تابعین اور تبع تابعین کی ایک کثیر جماعت نے دینِ متین کے ہر ہر پہلو کو اُجاگر کرنے کے لیے کس طرح اپنی زندگی کا لمحہ لمحہ وقف کر دیا، ان میں مفسرین بھی ہیں، محدثین بھی، علمائے راسخین اور اولیائے کرام سب ہی شامل ہیں۔

جب یہ بات واضح ہوگئی تو یہ بھی جان لینا ضروری ہے کہ قرآن کریم کی فہم کے لیے محض اپنا قیاس اور اپنی رائے ہرگز کافی نہیں۔ ہر سند کو پہلے ایمان کی کسوٹی پر دیکھنا ہوگا۔ پھر فرمانِ رسول ﷺ کی تلاش کے لیے ہمیں اُن مخلص جماعتوں کی طرف رجوع کرنا ہوگا جنھوں نے اس کی تفسیریں سالہاسال کی کاوشوں کے بعد کیں۔ اس میں بھی سب سے اہم پہلو تسلسل اور تواتر کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ ممکن ہے کہ کسی ایک شخص سے کوئی نادانستہ غلطی ہوئی ہو لیکن معیارِ تسلسل اور تواتر پر جب کسی مسئلہ کو پرکھا جائے گا تو یہ غلطی

بآسانی نمایاں ہو جائے گی۔ اس لیے اس کتاب ""انوارِ حدیث" میں اس تسلسل اور تواتر پر تحقیقِ حدیث کے سلسلہ میں بالخصوص بہت زور دیا گیا ہے۔

اگر ہم ذرا بنظرِ غور دیکھیں تو خود قرآن حکیم نے صداقتِ اسلام کی حقّانیت کو واضح کرتے ہوئے اسی تسلسل عقیدۂ توحید ورسالت و آخرت پر زور دیا ہے اور یہ بات ذہن نشین کرائی ہے کہ آفرینش عالم سے آج تک تمام انبیاء علیہم السّلام ایک ہی وحدہٗ لاشریک کی عبادت کا حکم دیتے رہے اس کی توحید کو اپنا شعار بنایا، اسی کی تبلیغ کی یہی نہیں بلکہ جملہ کتب سماویہ جو ان پر نازل کی گئیں سب اسی تسلسل عقیدۂ توحید و آخرت پر شاہد ہیں اور سب ہی نے ایک نبی آخر الزّماں کی شہادت دی انبیاء نے بھی کتب سماویہ نے بھی کہ دین اسلام کی تکمیل حضور ﷺ کے ہی مبارک ہاتھوں سے ہونا ہے۔

پہلے ہی پارے کے آخر میں سنّتِ ابراہیمی کی عظمت یوں ذہن نشین کیجاتی ہے کہ "دینِ ابرہیمی سے کون روگردانی کرے گا سوائے اس کے کہ وہ خود حماقت میں مبتلا ہو۔ پھر اس واقعہ کی یاد دلاتا ہے جب حضرت ابرہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ بیشک اللہ نے تم کو دین چُن کر دیا ہے تم اس سے ہرگز منکر نہ ہونا۔ جینا تو اسلام پر جینا مرنا تو اسلام پر مرنا۔ اسی طرح حضرت یعقوب علیہ السلام جب وصیّت فرماتے ہیں تو اپنے بیٹوں سے دریافت فرماتے ہیں کہ تم کس کی عبادت کروگے اور وہ جواب دیتے ہیں آپ کے رب کی اور آپ کے باپ دادا ابراہیم علیہ السلام، اسمٰعیل علیہ السلام اور اسحاق علیہ السلام کے معبود کی کہ وہی تو خدائے واحد ہے۔

یہی توحید، یہ مسلسل پیغامِ توحید سرورِ کائنات ﷺ کی زبانِ مبارک سے یوں عام کرنے کا حکم ہوتا ہے کہ آپ فرمادیجئے کہ "ہم نے ابراہیم علیہ السلام کی راہ اختیار کی ہے جو یکسوئی کے ساتھ اللہ کے ہو رہے اور وہ تو (اے یہود و نصاریٰ!) تمہاری طرح مشرک نہ تھے

اور اسی کے بعد مسلمانوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ تم کہہ دو کہ ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور جو اُترا ہم پر (یعنی قرآن) اور جو اُترا ابراہیم علیہ السلام، اسمٰعیل علیہ السلام، اسحاق علیہ السلام، یعقوب علیہ السلام اور اُن کی اولاد پر اور جو عطا ہوا موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کو اور جو پیغمبروں کو ان کے رب سے ملا۔"
(اقتباس از ترجمہ آیات سورۃ بقرۃ)

یہی نہیں بلکہ سنت اللہ کا ذکر بھی وعدہ اور وعید کی صورت میں کیا جاتا ہے۔ بات یہ ذہن نشین کرنا ہے کہ اسلام کی فہم کے لیے اللہ کا حکم فرمودۂ رسول اور صحابۂ کرام اور تابعین کا عمل ہی تمام امورِ دینی میں ایک مفکرِ اسلام کے ہمیشہ نظر رہے، ورنہ اندیشہ ہے کہ وہ اپنی نا سمجھی کے باعث "اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ" کی فہرست سے نکل نہ جائے اور گمراہ نہ ہو جائے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ نماز میں پڑھے جانے والے درود جس کو بالعموم درودِ ابراہیمی کہا جاتا ہے، اس دور میں اسی تواتر عقدی اور تواترِ عہدی کی یادیں تازہ کی جاتی ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آل میں ان کے اصحاب، متبعین، تابعین وہ سب شامل ہیں جنھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تعلیمات کو مشعلِ راہ بنایا اور دین متین کی فہم کے لیے اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام میں فرق نہ کیا۔ اپنی قیاس آرائیوں سے بچے جو دل میں آیا اسے اسلام نہ سمجھ بیٹھے۔ یہی وجہ ہے کہ آج علمائے کرام دین کے اُمور میں تواتر و تسلسل کو بڑی اہمیت دیتے ہیں، خواہ وہ تواترِ عقدی و عہدی ہوں یا تواترِ عملی، تواترِ سندی یا تواترِ استشہادی۔ بقول حضرت ڈاکٹر عبد الرشید صاحب مرحوم و مغفور اگر اس تواتر و تسلسل کو "نظر انداز کر دیا جائے تو ایمان واسلام واحسان کے جواہر میں سے کیا باقی رہ جاتا ہے[۲۴]"۔

۲۴۔ از خطاب حضرت ڈاکٹر عبد الرشید صاحب مرحوم، استاد جامعہ کراچی۔ آہ یہ دانائے راز محترم ڈاکٹر عبد الرشید صاحب رحمۃ اللہ علیہ، ۱۲ ربیع الاوّل جمعرات کے دن اسی سال ۱۴۰۵ھ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

"تواتر و تسلسل کی جہاں دینِ متین کے ہر ہر شعبے میں یہ اہمیت حاصل ہو، وہاں اس تواتر و تسلسل کو احادیث کی چھان بین میں کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے کہ ارکانِ اسلام کا دارو مدار ہی عملِ رسول ﷺ پر ہے۔ خواہ نماز ہو یا زکوٰۃ حج ہو یا روزہ۔ کیسی نادانی ہوگی کہ کلمہ طیبہ کے برگ و بار سے ہم اپنے ظاہر و باطن کو عریاں کر دیں"۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی مکمل صورت کو پانے کا وسیلہ انوارِ نبوّت ہی ہیں خواہ وہ فعلاً ہوں، قولاً ہوں یا حالاً۔ نبی کریم ﷺ کے پیش نظر ایک وحدہٗ لاشریک کا تصوّر ہی رہا ہے اور ہر فکر محدود سے بلند ہو کر اللہ کی جمیع مخلوق کی فلاح و بہبود ہی اللہ کے رسول کا نصبُ العین تھا۔

آپ ﷺ کا ہر فعل اسلام کی ہمہ وقتی، ہمہ جہتی اور عالمی وحدت کا ترجمان تھا جو انسانوں کو وحدتِ انسانی کی طرف گامزن کر کے ایک وحدہٗ لاشریک پر ایمان کا درس دیتا تھا۔ اسی لیے اللہ ربُّ العزّت نے آپ ﷺ کو کائنات کے لیے رحمت، عالمین کے لیے رحمت اور خاتم النّبیین بنا کر بھیجا تاکہ آپ ﷺ کی رحمت و ہدایت کے چشمے ابد الآباد تک جاری رہیں اور جب بھی انسانیت کو صلح و امن، فلاح و بہبود کی تلاش ہو تو انھیں کے دامنِ رحمت سے وابستگی شرطِ اوّلین قرار پائے۔ اللہ ربُّ العزّت ہمیں اس نکتۂ ایمانی پر قائم و دائم رکھے اور ہر اس فتنہ سے بچائے جو گمراہی کا سبب ہو۔

اَللّٰھُمَّ یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ ثَبِّتْنِیْ عَلَی الْاِیْمَان۔

احقر العباد: حاؔمد بلگرامی

لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیۡهِمۡ [النحل ١٦: (٤٤)]

انوارِ حدیث

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

تمہید

عہدِ حاضر تمدنی ارتقاء کا زمانہ ہے، انسانی اذہان اور عملی صلاحتیں کُھل کر میدان میں آگئے ہیں۔ فطرت کے اسرار نہفتہ پر خاکی نژادوں کا دسترس روز بروز اس تیزی سے بڑھتا جارہاہے کہ کم علموں اور کوتاہ بینوں کی نگاہیں خیرہ ہورہی ہیں۔ ان حالات مین قطعاً خلافِ توقع نہیں ہے، اگر ایک بڑا گروہ انسان کی خدائی سے مسحور ومتأثر ہو کر حقیقی خدا کو بھول جائے اور دنیاوی عیش وتنعّم کی رنگینیوں میں مست ہو کر جناتِ عدن کے تصوّر سے منہ موڑ لے۔ انسان کا آغاز ایک قطرۂ آب اور انجام موت کا پنجۂ آہنی نہ ہوتا، تو عوام ہی نہیں خواص بھی اپنی اُلوہیت کا ڈنکا بجانے میں ایک دوسرے کے حریف نظر آتے، مگر آسمان وزمین کی کامیاب پیمائش کے بعد بھی ہر انسان اپنے وجود وبقا اور قیام وفنا کے معاملہ میں اسی طرح بے بس وناچار ہے، جس کا رُخ آج سے ہزاروں سال پیشتر کسی پہلے انسان کو سامنا کرنا پڑا تھا، بلکہ اگر طبعی زندگی کا موازنہ نہ کیا جائے، تو آج کا انسان اپنے اسلاف کے مقابلے میں قلیل الامداد اور کوتاہ ہوتا جارہاہے۔ ہماری ساری ترقیاں صفحۂ ہستی پر نئے پھول تراش رہی ہیں، مگر اپنی ذات جوں کی توں عاجز ومجبور ہے۔ اندرونی حقیقت تو کیا بدلتی۔۔! ظاہری رنگت میں کوئی فرق نہیں آیا، کالی، گوری، لال، پیلی چمڑیاں بدستور قائم ہیں۔

اسلام سے اِعراض

اب سوال یہ ہے کہ انسان جب اپنی ذات کے لحاظ سے اسقدر ناتوان ومجبور ہے، تو پھر خدائے توانا وقادر کی طرف سے اس کی نگاہیں کیوں پھر گئیں اور دین کے سرچشمے کی

سیر ابی کے لیے اس کی روح کیوں آگے نہیں بڑھتی، وہ مذاہب جو عقل وخرد کے مخالف تھے، اگر انسانوں نے ان کا جوا گردن سے اُتار پھینکا تو مقامِ تعجب نہیں ہے، مگر اُمت مسلّمہ کیوں پیچھے کی طرف تیزی سے ہٹ رہی ہے۔۔! حالانکہ قرآن وسنت نہ تو انسانی افکار کو معطل کرتے ہیں اور نہ قوائے عملی کو، بلکہ بنی نوع انسان کی ان دونوں اعلیٰ صلاحیتوں کو اُبھار کر صحیح راستہ پر لگاتے ہیں۔

گمراہی کا سبب

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی صف میں آج کچھ لوگ ایسے نظر آرہے ہیں، جن کی زبان مذہب کے خلاف بے لگام ہے۔ یہ اسلام کے زیرِ سایہ پروان نہیں چڑھے، بلکہ انہوں نے ماحولِ غیر میں تربیت پائی اور اسلام کو غیر مسلموں کی نگاہ سے دیکھا اور جو کچھ دیکھا، اپنی زبان سے دُہرا رہے ہیں، ان کے افکار کا منبع قرآن وسنت نہیں ہے، بلکہ یورپ کے مستشرقین ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ جو شخص اپنی پاکدامنی کھو بیٹھے، وہ طعنِ خلق سے بچنے کے لیے دوسروں کو بھی اپنا ہم رنگ بنانا چاہتا ہے۔ شیطان بارگاہِ الٰہی سے مردود ورجیم ہو کر نکلا، تو اب اس کی تمام تر کوشش یہی ہے کہ ساری اولادِ آدم کو رجیم ومردود بنا دے۔

دنیا کے دوسرے تمام اہلِ مذاہب اپنے ادیان کی بے بضاعتی سے اچھی طرح آگاہ ہیں۔ الہامی کتابوں کے تغیر وتحریف کے قائل ہیں۔ ایک لے دے کر صرف اسلامی تعلیمات ہیں، جن میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوا، قرآن مجید آغاز نزولِ وحی سے لے کر آج تک علی حالہ غیر محرف اور اپنی اصلی شکل میں موجود ہے۔ ضعیف وموضوع روایتوں کے امتزاج کے بعد بھی صحیح روایتوں کا نقد وانتخاب آسان ہے، انتہا یہ ہے کہ ائمۂ کبار وسلفِ صالحین کے اقوال وفتاوے بھی ہماری دسترس سے باہر نہیں ہوئے۔ ایشیائی اقوام تو خیر مغلوب

ومغضوب ہیں، ابھی ان کو اپنی قیامِ بقا ہی کی فکر سے نجات نہیں ملی ہے، مگر یورپ کے سامراجی اپنے دنیاوی اقتدار کو سامنے رکھتے ہوئے جب اپنی مذہبی کتابوں کی طرف نظر اٹھاتے ہیں، تو اُنہیں بڑی مایوسی ہوتی ہے اور حاسدانہ جذبات سے متاثر ہو کر اس کے درپے ہو جاتے ہیں کہ دنیا کی محفوظ الہامی کتاب اور یکتا پیغمبر کی زندگی کے مکمل نقوش کسی طرح متغیّر ہو جائیں، تاکہ اس حمامِ عالم میں کوئی جامہ پوش نظر نہ آئے اور اس طرح دنیاوی سربلندی کے ساتھ دینی اُمور میں بھی علمبرداری کا مقام حاصل ہو۔ توریت اگرچہ عبرانی زبان میں موجود ہے، مگر عبرانی خود بول چال کی زندہ زبان نہیں۔ نیز اہلِ توریت کے اقرار کے مطابق موجودہ توریت عیسیٰ علیہ السلام کی کتاب سے ماخوذ ہے، اصلی توریت نہیں ہے کیونکہ اس میں موسیٰ علیہ السلام کی وفات اور اس کے بعد کے حالات درج ہیں۔ عرصۂ دراز تک توریت گم رہی، یہاں تک کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے ہزاروں سال بعد حضرت عزیر علیہ السلام نے اس کو ربّیوں اور کاہنوں کی مدد سے دوبارہ مرتب کیا۔

انجیل مقدس تو روزِ اول ہی حواریوں کے تشتت وپراگندگی کا شکار ہوگئی۔ یہاں تک کہ آج دنیا میں اصل انجیل مفقود ہے اور ہر علاقائی زبان میں صرف تراجم پر دینِ مسیحی کا بے بنیاد محل کھڑا کیا ہے، صرف اس پر بس نہیں، بلکہ یہود ونصاریٰ کے مختلف فرقے توریت وانجیل کے مختلف نسخوں کو ''كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ''[۲۵] (ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے اُس پر نازاں وخوش ہے) کے مصداق اپنی محرف کتابوں پر خوش ہیں۔

---

[۲۵] المؤمنون ۲۳: (۵۳)۔

حیرانی ہے کہ تمام انسانوں کو اس پر خوش ہونا چاہیے تھا کہ بہر حال ان کی نوعی میراث میں ایک الہامی کتاب بھی موجود ہے، جو تغیراتِ زمانہ سے آج تک محفوظ رہی۔ دین کے اس تاریخی ریکارڈ کا کتابی شکل میں ڈیڑھ ہزار سال تک غیر متبدل رہنا خود انسانیت کے لیے دلیلِ رفعت و عظمت ہے اور مسلمانوں کو اس پر فخر کرنا چاہیے اور اللہ و رسول کا شکر گذار ہونا چاہیے کہ عظمتِ انسانی کا جوہر بے بہا ان کے پاس ہے، مگر ان مغرب پرست نادانوں کو کون سمجھائے جو غلامانہ ذہنیت میں مبتلا ہو کر عزت و ناز کے احساسات سے بھی ناآشنا ہو چکے ہیں اور کعبۂ یورپ کے شوقِ طواف میں لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں۔ سچ ہے کور چشمی سے کور باطنی زیادہ تباہ کن ہے۔ شیدائے مغرب ہونے کے بعد یہ غریب مشرقیت سے تو محروم ہو ہی گے، مگر اہل مغرب میں بھی ان کو کوئی مقام نہیں ملا۔ نہ اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے۔

دعویٰ قرآن فہمی

انجیل ترجموں سے پڑھی جاتی ہے اس لیے کہ انجیل کا Original text ناپید ہے، چند مغرب زدہ حضرات بھی قرآن مجید کو اس کے تراجم سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور بزعم خود اس کے دعویدار ہیں کہ قرآن فہمی کا حق ادا ہو رہا ہے، جو کچھ انھوں نے سمجھا ہے، وہی حقیقت ہے دنیا کے تمام مسلمانوں کو ان کی سمجھ پر ایمان لانا چاہیے:

بسوخت عقل زحیرت   کہ ایں چہ بوالعجبی ست

اس قسم کی کج فہمیاں اسی سے ظاہر ہو سکتی ہیں، جو حقیقت سے دور جا پڑا ہے۔ اگر ترجموں کا سہارا اتنا کامیاب ہوتا، تو آپ یقین مانیں کہ مشرقِ اوسط کے تمام باشندوں کی فہمِ قرآنی غیر عرب کے مقابلے میں زیادہ قابلِ قبول ہوتی؛ کیونکہ وہ عربی زبان سے آشنا ہی نہیں

بلکہ عربی ان کی زبان ہے اور حیدر آباد دکن کا ہر باشندہ ڈاکٹر، انجنیئر، فلسفی، سائنسداں اور ماہرِ اقتصادیات ہوتا؛ کیونکہ اردو اس کی اپنی زبان ہے اور یہ علوم وفنون وہاں کی تعلیم گاہوں کے اندر اردو میں پڑھائے جاتے تھے، انگلستان وجرمنی، فرانس اور امریکہ کا ہر فرد دنیا کے تمام فنون میں کامل واکمل ہوتا؛ کیونکہ ہمارے سائنسداں ان زبانوں کی مدد سے سائنس کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور ان ممالک کے باشندے تو انھیں زبانوں کے ساتھ گویا پیدا ہوتے ہیں اور ہمارے ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کے مقابلے میں اپنی زبانیں زیادہ سمجھتے اور جانتے ہیں۔ لیکن واقعہ اس کے خلاف ہے، نہ تو ہر عرب عالمِ دین ہے اور نہ ہر انگریز سائنسداں و فلسفی، حقیقت یہ ہے کہ زبان دانی وفن دانی دو جُدا گانہ اُمور ہیں۔ فن دانی کے لیے زبان دانی بنیادی شرط ہے۔ لیکن محض زبان دانی سے فن دانی نہیں ہوتی اور جو لوگ کسی فن سے متعلق اساسی زبان سے ناواقف ہوتے ہیں، وہ اس مخصوص فن سے بھی ناآشنا و نابلد رہتے ہیں۔ اگر ترجموں کی مدد سے کچھ فہم وِادراک میسّر بھی آجائے، تو اُن کی حیثیت محض اُس نمی کی سی ہے، جو کسی تیز فوارے کے نزدیک ہلکی پھوار سے پیدا ہوتی ہے، ورنہ اصل سیر ابی آبِ رواں تک رسائی حاصل کیے بغیر ناممکن ہے۔ بعض نادان افراد قرآن مجید کے اردو انگریزی تراجم پڑھ کر علومِ اسلامیہ کی مہارت کے مدعی ہیں اور بزعم خود یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ انھوں نے جو کچھ سمجھا ہے، یہی حقیقی اسلام ہے۔ اس غلط فہمی کو قدماء کی اصطلاح میں ''جہلِ مرکب'' کہتے تھے اور آج کل کی زبان میں ''مُلّائیت'' سے تعبیر کرتے ہیں اور بدقسمتی سے اس کج بینی وکور باطنی کے شکار چند ایسے افراد ہیں، جنہیں قدیم عیسائی اقتدار کی خیرات سے کچھ عہدے اور اچھی تنخواہیں میسّر آگئی ہیں۔ ان کی تربیت سرکارِ برطانیہ کے ظلّ عاطفت میں ہوئی تھی اور غلامانہ ذہنیت لے کر جوان ہوئے ہیں۔ تعلیم کا معیار اور حصولِ تعلیم کی غایت اس کے سوا

اور کچھ نہ تھی کہ وہ انگریزی کی اونچی ڈگریاں حاصل کر کے ذمہ دار غلام بن سکیں گے، ان بے چاروں تک علم کی شعاع پہنچی ہی نہیں تھی۔ اب بدلتے ہوئے حالات میں جب کہ اجنبی آقا کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اور فضاؤں میں ہر لحظہ ہر آن قرآن وسنّت کی گونج سنائی دے رہی ہے، اِن کو اپنے موجودہ اقتدار کے زوال کا اندیشہ ہے۔ سامراج برطانیہ کے فکری نسل والے مسلمان آزادی وغلامی، مشرقیت ومغربیت، دینداری ولا دینی، عیسائیت واسلام کی آخری جنگ لڑ رہے ہیں، پہلی کوشش تو یہ ہے کہ اسلام کی آواز بالکل دبا دی جائے اور قرآن وسنّت نام کی کوئی چیز حدودِ پاکستان میں رہنے نہ پائے، مگر اس محاذ پر مقابلہ زیادہ دشوار تھا، اس لیے عیارانِ پُر فن نے اپنے پینترے بدل دئے اور اپنے سروں پر دستارِ علمیت کو پیچ دینے کی کوشش کرنے لگے۔

فرنگی ملّا اور اس کی خطرناک چال

علومِ دینیہ کے مختلف اساس ہیں، قرآن، سنّت، فقہ، عقائد، ان میں سے عقائد کو یہ کہہ کر علیحدہ کر دیا کہ قدیم یونان کی فلسفیانہ باتیں ہیں، جن کی موجودہ زمانے میں کوئی وقعت باقی نہیں رہی، اس لیے اس اصول وبنیادی اعلامیے کو علومِ دینیہ سے قطعاً خارج کر دینا چاہیے۔ فقہ کا ذخیرہ اتنا وسیع ہے کہ سرسری مطالعے سے ان تک رسائی ممکن ہی نہیں۔ لہٰذا ان کو مسلمانوں کے نزاعی مسائل کا نام دیکر قوانینِ ملکی سے الگ کر دیا۔ اب دو بنیادی چیزیں رہ گئی تھیں، ایک قرآن مجید، دوسری سنّت رسول ﷺ۔ ان میں حدیثوں کے مجموعے اتنے زیادہ اور محنت طلب ہیں کہ اگر عالمِ دین بننے کے لیے بنیادی شرط قرار دیے گئے، تو پھر سخت مشکل ہو گی اور پھر علماء کی اہمیت اور ضرورت سے نجات نہیں ملے گی اور خود عالم بن کر نئے ماحول میں مقامِ بلند حاصل نہیں کر سکیں گے۔ اس لیے اللہ تبارک

وتعالیٰ کے فرمان ﴿اَطِیۡعُوا اللّٰهَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ﴾[26] (اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو)۔ ﴿وَمَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوۡلُ فَخُذُوۡهُ‌ وَمَا نَهٰىكُمۡ عَنۡهُ فَانۡتَهُوۡا‌ۚ﴾[27]۔ (جو کچھ رسول تمہیں دیں، لے لو اور جس سے منع کریں باز رہو)۔ ﴿قَدۡ جَآءَكُمۡ مِّنَ اللّٰهِ نُوۡرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيۡنٌ﴾[28]۔ (تمھارے پاس اللہ کی جانب سے نور یعنی رسول آئے اور کتاب مبین، یعنی قرآن آیا) کے خلاف کھلی بغاوت شروع کردی اور ایک قلم تمام حدیثوں کو من گھڑت اور طومار کہہ کر رد کردیا۔

آئندہ صفحات میں احادیث کی کثرت، ان کی اہمیت اور حقانیت کو عام فہم انداز میں پیش کیا گیا ہے اور ان سے متعلق جملہ امور پر الگ الگ ابواب میں بحث کی گئی ہے، تاکہ اس عظیم فتنہ ''انکارِ حدیث'' کا سد باب ہو سکے۔ اللہ ربُّ العزّت سے دعا ہے کہ اسے طالبانِ حق کے لیے موجبِ ہدایت بنادے۔

۲۶ النساء۴: (۵۹)۔

۲۷ الحشر۵۹: (۷)۔

۲۸ المائدۃ۵: (۱۵)۔

باب اوّل

حدیثوں کی کثرت اور اس کے اسباب

(زبان کی نفسیات اور عربی زبان کی خصوصیات)

ذرا غور فرمائیے کہ آج کسی بڑے لیڈر کی چند سالہ سوانح حیات لکھی جاتی ہے، جس میں اس کے مختصر سے حصہ زندگی کے چند خاص پہلوؤں کی تفصیل بیان ہوتی ہے، اس پر کئی کئی جلدیں مرتب ہو جاتی ہیں۔ مگر رسول اکرم ﷺ کے ۲۳ سالہ دورِ اصلاح کی کامل تفصیلات بیان کی جائیں، خواب و بیداری، سفر و حضر، اکل و شرب، لباس و رہایش، اہلی و معاشری، عبادت و تبلیغ، صلح و جنگ، تجارت و سیاست، غرض دنیا میں جس قسم کے بھی بڑے انسان ذہن میں آسکتے ہیں اور ان کے جداگانہ خصوصیات پر نگاہیں جاسکتی ہیں، وہ سب کے سب حضور اکرم ﷺ کی ذات میں جمع ہیں اور کوئی چھوٹا بڑا پہلوئے حیات ایسا نہیں ہے، جس کو جاں نثارانِ مصطفوی ﷺ نے بیان نہ کیا ہو۔ یہ تفاصیل اگر حدیثوں کی ضخیم جلدوں کی صورت میں ہمارے پاس مہیّا ہو جائیں، تو خلاف عقل وروایت نہیں ہے، بلکہ اس کے خلاف ہوتا، تو عقل و تعجب کی بات تھی۔ مزید بر آں اصحابِ رسول ﷺ کا شمار لاکھ سے زیادہ ہے اور پھر ان کے تلامذہ کی تعداد لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے، جنھوں نے رسول اکرم ﷺ سے متعلق ہر قول و فعل کی دریافت وروایت میں پورا انہماک دکھایا۔

حقیقت یہ ہے کہ منکرینِ حدیث نادان تو نہیں ہیں کہ وہ اتنی موٹی سی بات نہ سمجھ سکیں، مگر ایٹمی رفتار سے عالم بننے کی راہ میں حدیثوں کا ذخیرہ حائل تھا، اس لیے انھوں نے حجتِ حدیث کا ہوسِ اقتدار میں انکار کر دیا۔ اور اب ان کے خیال میں حصولِ مقصد بہت

آسان تھا، یعنی قرآن مجید کو اردو انگریزی میں تراجم کی مدد سے پڑھ لیا اور عالم بن کر فتوے دینے لگے۔ عوام اس کبر و مکر کو نہ سمجھ سکیں، لیکن کوئی پڑھا لکھا آدمی اس طریقۂ علمیت کو کبھی قبول نہیں کر سکتا۔ علمائے دین کا کیا سوال ہے دنیا کے ماہرینِ اَلسنہ بھی مغرب پرستوں کی اس ملائیت کے خلاف ہی فتویٰ دیں گے۔

ترجمہ کی حیثیت اور ماہرینِ لسانیات کی رائیں

ماہرینِ اَلسنہ اس پر متفق ہیں کہ ترجموں کے ذریعے ایک زبان کے جزوی مفہوم دوسری زبان میں منتقل ہوتے ہیں، مگر ایک زبان سے دوسری زبانوں میں مضامین کا کلی انتقال ممکن نہیں ہے۔ ہر زبان کے الفاظ کے جو بہتر عوامل کار فرما ہوتے ہیں، مثلاً قومی مزاج، قومی تمدن، قومی روایات وغیرہ، جن کو اس زبان کے الفاظ کی وضع وانتخاب میں بڑا دخل ہے، وہ دوسری زبان میں کیونکر منتقل ہونگے مثلاً دختر Daughter(ڈوٹر) اور دوہتر، یہ تین الفاظ عہدِ حاضر کی تین جداگانہ زبانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ معنی اور اصل کے اعتبار سے ایک ہیں، یعنی قدیم آریہ زبان ان کا ماخذ ہے اور آج بھی لڑکی کے معنی میں بولے جاتے ہیں۔ اگر ہم ان الفاظ کی تحلیل کریں اور ان تاریخی حقائق کو سامنے رکھیں، جو پہلے پہل لڑکی کے لیے اس لفظ دوہتر کی وضع کے محرک تھے، تو آپ کے سامنے قبل تاریخ وید کے دور سے لے کر آج تک کے آریوں کی معاشرت، تمدن خوراک، قومی مزاج اور پھر ان کے آئندہ ادوار کے انقلابات کی ایک طویل تاریخ مرتب ہو جائے گی۔

محض اشارے کے طور پر یوں سمجھئے کہ ان تینوں الفاظ میں 'دوہتر' کا لفظ سب سے قدیم اور پرانے ویدک عہد کا لفظ ہے، جس کی ترکیب 'دوہ تر' سے ہوئی ہے۔ لفظی معنی دودھ دوہنے والی یعنی Milk Maid۔ آپ اس لفظ کی مدد سے قدیم آریوں کی تاریخ سے

ماضی مابعد کا نقاب اٹھائیے تو یہ چند باتیں معلوم ہوتی ہیں کہ آریہ ایک قوم تھی، جو کسی سرسبز شاداب علاقے میں رہتی تھی۔ ان کے معاش کی بنیاد جانوروں کی پرورش اور زمین کی پیداوار، ان کی خوراک کے اہم اجزا دودھ اور دودھ سے حاصل شدہ چیزیں۔ گائیوں کے تھن مرد نہیں چھوتے تھے۔ لڑکیاں دودھ دوہا کرتی تھیں۔ گائیوں کی رکھوالی لڑکیوں کے ذمہ تھی۔ لڑکیاں اپنے میکے میں خدمت گذاری میں مشغول رہتیں، کیونکہ ان کے لیے جو لفظ (دوہتر) وضع کیا گیا۔ وہ مالکانہ حیثیت کے برخلاف خادمانہ حیثیت کو ظاہر کرتا ہے۔ قدیم آریائی تمدن میں لڑکیوں کی نمایاں حیثیت نہ تھی وغیرہ وغیرہ۔ پھر اس لفظ دوہتر سے انگریزی ڈوٹر (Daughter) کا استخراج بناتا ہے کہ آریہ قوم اپنے اصل وطن سے نکل کر مختلف امصار وبلاد کو طے کرتی ہوئی انگلستان تک جاپہنچی۔ ان دونوں منزلوں کے درمیان جو نہ جانے کتنے مقامات اور ہیں، ان کو تلاش کیجیے۔ اور ہر جگہ آریائی نشانات واثرات کا کھوج لگائیے، پھر یہ معلوم کیجیے کہ اپنے وطن اصلی سے کیوں منتشر ہوئے؟ کن سیاسی ومعاشی عوامل ومحرکات نے ان کو ترکِ وطن پر مجبور کیا؟ وغیرہ وغیرہ۔

پھر یہ معلوم کیجیے کہ لفظ 'دوہتر' آج فارسی میں 'دختر' سے بدلا ہوا ہے۔ کسی بیرونی فاتح کی یادگار ہے، جو حروف ہجا میں حرفِ ''خ'' کا استعمال زیادہ کرتے تھے اور انھوں نے اس آریائی تلفظ کو بدل دیا۔ اس لیے ترجمہ میں ایک زبان کے الفاظ کی جگہ پر جب ہم دوسری زبان کے الفاظ رکھتے ہیں، تو حقیقتاً ایک قوم کے تصورات ومزاج کو دوسری اقوام کے تصورات ومزاج سے بدلنا چاہتے ہیں، جو یقیناً محال وناممکن ہے۔ صرف جزوی تصور ہوتا ہے، حقیقی وکلی انقلاب نہیں ہوسکتا۔

اسی طرح ماہرینِ اَلسنہ کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ کسی ایک زبان میں ایک ہی مفہوم کو ادا کرنے کے لیے دو الفاظ نہیں ہوتے، جنھیں اصطلاحاتِ لغت میں 'مرادفات' کہتے ہیں، کیونکہ وضعِ الفاظ کی غرض وغایت جب ایک لفظ سے پوری ہو گئی، تو لفظِ ثانی کے ایجاد کی سرے سے ضرورت نہ تھی۔ ہاں جزوی اختلاف کی وجہ سے جداگانہ الفاظ حسبِ ضرورت وضع ہوتے چلے گئے۔ کسی زبان میں مترادفات کا اقرار حقیقتاً اقرار کرنے والے کی کم علمی کی دلیل ہے، جو اصل زبان کے باریک فرق سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ترادف ہونے کے دعویدار ہوتے ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ عربی زبان میں مترادفات بکثرت ہیں، یہاں تک کہ ایک اونٹ کے لیے کئی سو الفاظ موجود ہیں، واقعہ یہ ہے کہ اونٹ کی اقسام ان کے رنگ، عمر کے اعتبارات سے علیحدہ علیحدہ الفاظ ہیں۔ یہ بالکل غلط ہے کہ ایک ہی مفہوم کو ادا کرنے کے لیے سینکڑوں الفاظ وضع ہو گئے۔ جب تک زبان عربی پر کامل وقوف نہ ہو، مفہوم کے باریک فرق کا اثر جو جداگانہ الفاظ کی صورت میں ظاہر ہوا ہے، کبھی دریافت نہ ہو گا اور ترجمہ میں اس کا لحاظ نہیں رکھا جا سکتا ہے۔ خصوصاً جب اصل وترجمہ کی زبانیں وسعتِ معانی و کثرتِ الفاظ کے لحاظ سے باہم ہم پلّہ نہ ہوں۔ زبان و ترجمے سے متعلق ہم نے ماہرینِ اَلسنہ کے متفقہ فیصلوں میں سے صرف دو کلیات بیان کیے ہیں، تاکہ عوام وخواص اس کو پیش نظر رکھیں اور قرآنِ حکیم کے محض ترجمہ کو جو کسی زبان میں بھی عربی سے کیا گیا ہو، اُسے دین کی فہم کا ذریعہ قرار نہ دیں۔ ان میں مستشرقین کے ترجمے اکثر موجبِ گمراہی ہیں اور دین کی محدود فہم رکھنے والوں کے ترجمے جن کی بنیاد مترجم کے ذاتی قیاس اور اجتہاد پر ہے، خطرے سے خالی نہیں۔ ان سے بھی اجتناب ضروری ہے۔

عربی زبان اور اُس کی امتیازی خصوصیات

اب ذرا عربی زبان کا جائزہ لیجئے۔ جس میں قرآن وحدیث کے علمی خزانے محفوظ ہیں، یہ زبان سامی اقوام کی زبان ہے۔ فارسی، اُردو، جرمنی، فرانسیسی، لاطینی وغیرہ انڈو یوروپین زبانیں ہیں۔

آریہ نسل کی زبانوں اور سامی زبانوں میں جس طرح نسلی فرق ہے، اسی طرح مزاج، تمدن، افکار اور تاریخیت میں بھی کامل بُعد ہے جس طرح آریہ وسامی اقوام ایک دوسرے کی خصوصیات کی کلی نمائندگی نہیں کر سکتیں۔ اسی طرح ایک نسل کی زبان دوسری نسل کی زبانوں کی تمام ترجانشینی ونیابت سے عاجز ہے۔ صرف جزوی مفہوم ترجمہ کی مدد سے ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہو سکتا ہے۔ خصوصاً ایک زبان کے ادبی شاہکار کو دوسری زبانوں میں منتقل کرتے وقت، فصاحت وبلاغت، حسنِ بیان، خوبیِ ادا، معنوی لطافت ودلکشی اور ان سے حاصل ہونے والے دیگر اثرات تو قطعاً منتقل نہیں کیے جاسکتے۔ اس نسلی فرق کے علاوہ عربی زبان اپنی وسعتِ معانی، کثرتِ الفاظ، کمالِ قواعد کی وجہ سے دنیا کی ممتاز ترین زبان ہے اور اس زبان میں حضورِ اکرم ﷺ کے اقوال فصاحت وبلاغت کے بلند ترین معیار رکھتے ہیں اور قرآن مجید ساری کائنات کے لیے عربی زبان کا معجزانہ مجموعہ ہے۔

اگر کوئی شخص قرآن وسنت کو سامی زبان سے آریائی زبان میں ترجمہ کر کے یہ چاہے کہ قرآن وسنّت کا یا اسلام کا کامل علم اس سے حاصل ہو جائے گا، تو لاریب جہلِ مرکب میں مبتلا ہے اور کسی فرنگی تربیت گاہ کا فارغ التحصیل مُلّا ہے، جس کو نہ اسلام کا علم ہے اور نہ اقوام کی لسانی خصوصیات کا علم ہے۔ آج جو عربی زبان وعربی قومیت کے خلاف عجمی نژاد مسلمان نسلوں میں کچھ عصبیت پائی جاتی ہے، یہ کوئی ایسی بات نہیں جس کی طرف آج

سے چودہ سو سال پہلے نگاہِ نبوت نہیں پہنچی تھی۔ حضور اکرم ﷺ نے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کو مخاطب[29] کر کے گویا آنے والی تمام عجمی نسلوں کو خبردار کر دیا تھا کہ عربوں سے عداوت ان کو عربی زبان کا مخالف بنا دے گی اور عربی مخالفت کا نتیجہ قرآن مجید سے ناواقفیت اور سرکارِ رسالت پناہ ﷺ کی ذاتِ گرامی و سنت سے ان کو غافل کر دے گی، دین ہاتھ سے جاتا رہے گا اور آکرت کی فلاح سے محرومی ہوگی، اس نصیحت و تنبیہ کے مخاطب حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نہ تھے، کیونکہ ان کی فدائیت و جاں نثاری ایک حقیقت ہے، بلکہ دراصل غیر عرب اقوام ہیں، جو عربی زبان سے تہاون برتتے ہیں اور قرآن و سنّت کو ترجموں کے ذریعے پڑھ کر مُلا بنے پھرتے ہیں اور علمائے دین کی تنقیص کرتے ہیں۔

یہ تو زبان سے متعلق چند بنیادی اُمور تھے، اب ذرا خم خانۂ فرنگ کے ملائے خراباتی خود اہلِ فرنگ کے ماحول کی طرف نظر اٹھا کر دیکھیں کہ ان کے پیرِ مغاں کی

۲۹۔ ملاحظہ ہو 'سنن الترمذی'، ج۵، ص۲۳۷، رقم: ۳۹۲۷، و'مسند ابی داود طیالسی'، ج۲، ص۴۸، رقم: ۶۹۳، و'مسند احمد بن حنبل'، ج۳۹، ص۱۳۵، رقم: ۲۳۷۳۱۔ 'مسند احمد' کے الفاظ یہ ہیں:

عَنْ سَلْمَانَ، قَالَ: قَالَ لِي رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «يَا سَلْمَانُ! لَا تُبْغِضْنِي فَتُفَارِقَ دِينَكَ»، قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ! وَكَيْفَ أُبْغِضُكَ وَبِكَ هَدَانَا اللهُ؟ قَالَ: «تُبْغِضُ الْعَرَبَ فَتُبْغِضُنِي».

یعنی: "حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: اے سلمان! مجھ سے عداوت نہ کرنا کہ کہیں اپنا دین ہی نہ چھوڑ بیٹھو، میں نے عرض کی: یارسول اللہ! میں آپ سے کیسے عداوت کر سکتا ہوں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپ ہی کے ذریعے ہمیں ہدایت دی ہے!، فرمایا: عرب سے عداوت کروگے تو گویا مجھ سے عداوت کروگے"۔

محفلوں کا کیا دستور ہے۔ بلاشبہ انجیل اپنی اصل زبان میں ناپید ہو چکی ہے اور جیسا کہ اوپر ہم کہہ آئے ہیں کہ علاقائی زبانوں میں جو کچھ انجیل کے نام سے موجود ہے، ان ملکوں میں مسیحیت انھیں پر قائم ہے، پھر بھی تمام باشندگانِ ملک و مذہبِ عیسوی کے لیے یہ سند نہیں مانے جاتے اور نہ کبھی وہ اس کے دعویدار ہوئے۔ دینِ مسیحی کے متعلق لب کشائی کا حق صرف انھیں اشخاص اور ایسی جماعت کو ہے، جو اپنی زندگی کا معتدبہ حصّہ مذہبی علوم کی تحصیل اور غور و فکر میں صرف کرتے ہیں۔ اسلام ان کے ان مساعی واستحقاق کے خلاف نہیں ہے، بلکہ ان سے ہمارا اختلاف صرف اس مسئلے میں ہے، جو انھوں نے نجات فروشی اور رہبانیت کے نام پر اپنا اقتدار قائم کرر کھا ہے اور اپنی طرف سے اعمال و معتقدات میں جن اُمور کو چاہتے ہیں، داخل کر دیتے ہیں اور جنھیں چاہتے ہیں دین سے خارج کر دیتے ہیں۔ مثلاً ۱۹۵۰ء میں پاپائے روم نے اعلان کر دیا کہ آج کیتھولک مسیحیوں کا عقیدہ یہ قرار پایا کہ حضرت مسیح کی طرح ان کی والدہ محترمہ جناب مریم صدیقہ بھی جسدِ عنصری کے ساتھ آسمان پر اُٹھالی گئیں [۳۰]، حالانکہ یہ حق صرف اللہ تعالیٰ کا ہے کہ اپنے بندوں کے اعمال و معتقدات میں جن اُمور کو چاہے داخل کر دے اور جن اُمور کو چاہے خارج کر دے اور اللہ کے ان حکموں کا اعلان پیمبر کی زبان سے ہوا کرتا ہے، کسی راہب، ربی، پوپ، عالم، حبر، مولوی، امام، مجتہد کو حلال و حرام کا مطلق اختیار نہیں ہوتا۔

---

۳۰ یہ اعلان یکم نومبر ۱۹۵۰ء کو بارہویں پوپ پائیس (Pious XII) نے باقاعدہ تحریری صورت میں کیا تھا، جس میں بائیبل کی مختلف آیات سے اس عقیدے کا ثبوت پیش کیا گیا ہے۔ تفصیلات کے مطابق اس دن کو 'عروجِ مریم' یا "Assumption of Mary" کے نام سے منایا بھی جاتا ہے۔ محقق عفی عنہ

اس غلط پاپائی اقتدار کے سوا اہلِ کلیسا کے اس حق کا انکار کہ مسیحی مذہب کے اصول و فروع کو ظاہر کرنے کے وہ حقدار ہیں، کسی احمق ہی سے ممکن ہے ورنہ جب آبائے مسیحی اپنی ساری زندگیاں دین کے افہام و تفہیم میں صرف کر رہے ہوں، تو دین کے متعلق بھی بولنے کا حق بھی انھیں کو ہونا چاہیے۔ کتنا بڑا ظلم ہے کہ زندگی بسر کریں خمخانۂ فرنگ میں اور کیفیت بیان کریں بادۂ حجاز کی۔

سطورِ بالا سے ہماری غرض یہ نہیں ہے کہ ترجموں کی مدد سے قرآن مجید کا مطالعہ غیر مفید ہے، بلکہ مدعائے اصلی یہ ہے کہ تراجم کی مدد سے قرآن مجید کا مطالعہ صرف اس حد تک محدود ہے کہ دین کی جزوی باتیں، قرآن مجید کا اجمالی علم حاصل ہوتا ہے، رہے آیتوں کے تفصیلی مطالب، اسرار، غوامض اور ہدایتِ الٰہیہ سے کامل استفادہ تو عربی زبان وعلوم قرآنیہ کے متعلقات کی صحیح واقفیت کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لیے جب تک اسلام سے کلی انکار نہ کیا جائے، علمائے دین کی خدمات سے ہم مستثنٰی نہیں ہوسکتے اور علوم دینیہ کی تعلیم کے لیے معیاری مدارس کے قیام کی طرف سے لاپرواہی درست نہیں ہوسکتی۔ غیر عربی دانوں کے لیے ازبس ضروری ہے کہ وہ بہر حال قرآن مجید کا مطالعہ ترجموں کی مدد سے کیا کریں۔ کیونکہ شبِ دیجور میں راہروی سے بہتر ہے کہ سحر کے دھندلکے میں آدمی مسافت طے کرے، اگر آفتاب کی جگمگاتی ہوئی روشنی میسّر نہیں آرہی ہے۔

زبان دانی کی شرطیں

اگر کسی زبان میں کوئی کلام آپ سنیں، تو صحیح مفہوم معلوم کرنے کے لیے مندرجہ ذیل اُمور کی واقفیت ضروری ہے:

اوّل جس زبان کا کلام ہے، آپ اس کو جانتے ہوں یا کم از کم ان تمام الفاظ سے پوری طرح واقف ہوں جو اس کلام کے اجزاء ہیں۔

دوم اس زبان کے قواعد سے اچھی طرح آگاہ ہوں۔

سوم اس زبان کے اصولِ بیان وبدیع کو جانتے ہوں۔

چہارم متکلم و مخاطب کے فرقِ مراتب کا علم ہو۔

پنجم اس موقع و محل کا علم ہو، جس میں یہ کلام ظاہر ہوا۔

ششم متکلم نے خود اپنے کلام کی کوئی وضاحت کی ہے یا کسی کو وضاحت کرنے کا ذمہ دار بنایا ہے، تو ان صورتوں میں اس کلام کو سمجھنے کی ایک شرط کا مزید اضافہ ہو جاتا ہے، کیونکہ اب اس کلام کے اندر لغوی اور اصطلاحی دونوں حیثیتیں پیدا ہو گئیں۔

ہفتم اس کلام کے مخاطب کون تھے اور کیا حاضرین ہی حقیقی مخاطب تھے یا مقصودِ خطاب ذہن میں یا خارج میں معہود اشخاص تھے؟

ہشتم اگر متکلم کا کلام براہ راست آپ نے نہیں سنا ہے، بلکہ بالواسطہ آپ تک نقل ہو کر پہنچا ہے، تو اس صورت میں دو مزید شرطوں کا اضافہ ہو جائے گا: (الف) تکلم کے وقت مستعملہ کلمات کے معانی کیا تھے؟ (ب) ناقلینِ کلام معتبر ہیں یا نہیں، جنھوں نے اس کلام اور کلمات کے معانی کو ہم تک پہنچایا ہے۔

نہم امثال و محاورات کا علم ہو، کیونکہ بعض حالتوں میں ترکیبِ خاص کی وجہ سے مفرد الفاظ کے لغوی معنی بدل جاتے ہیں۔

خصائص لغتِ عرب

امور مذکورہ بالا تو ہر زبان کے کلام سمجھنے کی بنیادی شرائط ہیں، لیکن زبان عربی کے لیے عموماً اور قرآن مجید کو سمجھنے کے لیے خصوصاً مندرجہ ذیل شرطوں کا اضافہ نہایت ضروری اور اہم ہے:

(۱) الفاظ کی دلالت باعتبار مطابقت و تضمن والتزام۔

(۲) پورے قرآن مجید کا ہمیشہ پیش نظر رہنا، کیونکہ بعض آیات دوسروں کی تفسیر و توضیح کرتی ہیں۔

(۳) عرب جاہلیہ کی زبان اور قبیلۂ قریش کی لغت کا علم۔

(۴) رسول اکرم ﷺ نے ان آیات قرآنیہ کی کوئی تشریح بیان کی ہے یا نہیں۔

(۵) صحابۂ کرام جو مخاطبِ اول تھے، انھوں نے قرآن مجید کے کیا مطالب بیان کیے ہیں۔

(۶) وضع کے اعتبار سے الفاظ کے معانی کا علم، یعنی حقیقت، مجاز، عموم، خصوص، مطلق، مقید، حذف، اِضمار، منطوق، مفہوم، اقتضاء، اشارہ، تنبیہ، ایماء وغیرہ جو عربی زبان کی خصوصیات ہیں اور دوسری زبانوں میں ان کا وجود نہیں ہے۔

ماحصل

یہ چند باتیں کلیات کی حیثیت رکھتی ہیں، جن کے بغیر کسی زبان کے کلام کو صحیح طور پر نہیں سمجھا جا سکتا۔ حیرت ہے کہ اللہ جل وعلا کا کلام جب دنیا میں موجود ہے اور عربی ایک زندہ زبان ہے، دنیا کے کروڑوں انسانوں میں رائج اور ان کی قومی زبان ہے، اس کے

قواعد وضوابط، مفرد و مرکب الفاظ کی تشریح کے سلسلے میں قدیم و جدید اہلِ فن کی کتابیں میسّر ہیں، تو پھر مقامِ تعجب ہے کہ لوگ اصل کلام سے استفادہ نہ کر کے صرف ترجموں پر اکتفا کریں اور قرآن فہمی کے مدعی بن جائیں۔

شیکس پئیر کے ڈراموں کا اردو میں ترجمہ کیا جاتا ہے، لیکن ادیبوں اور زبان دانوں کا خیال ہے کہ ترجمہ میں نہ تو انگریزی زبان کی ادبی خوبیاں ظاہر ہوتی ہیں، نہ شیکس پئیر کا زورِ بیان منتقل ہوتا ہے اور نہ معنوی لطافت پیدا ہوتی ہے۔ حالانکہ انگریزی اور اردو انڈو یُوروپین (Indo-Europian) زبانیں ہیں اور دونوں میں سے کوئی زبان بھی عربی کی وسعت وکمال کو نہیں پہنچتی۔ پھر عربی ادب کا شاہکار یعنی قرآن مجید جو معجزانہ کلام ہے اردو میں پہنچتی۔ پھر عربی ادب کا شاہکار یعنی قرآن مجید جو معجزانہ کلام ہے اردو میں منتقل ہو کر وہ تمام لفظی و معنوی حیثیات کا کیونکر حامل ہو سکتا ہے۔۔۔!

گر مصوّر صورتِ آں جانِ جاں خواہد کشید
حیرتے دارم کہ نازش را چساں خواہد کشید [۱۳]

علاوہ ازیں عربی زبان میں بکثرت الفاظ ایسے ہیں، جن کے متعدد معانی ہیں اور بعض الفاظ لغتِ اضداد سے تعلق رکھتے ہیں۔ مترجم ان میں سے کسی ایک معنی کو بیان کرے

---

[۱۳] یعنی: اگرچہ مصور اپنے محبوب کی تصویر بنا بھی لے گا، پر مجھے حیرت ہے کہ اُس کے ناز وانداز کی تصویر کیسے کھینچے گا۔

نوٹ: متن میں مذکور کلماتِ شعر ہمیں نہیں ملے، البتہ درج ذیل کلمات کے ساتھ شعر یوں ملا ہے:

گر مصور صورتِ آں دلستاں خواہد کشید
لیک حیرانم کہ نازش را چساں خواہد کشید

گا، مگر دوسرے معنی سے کیا اثرات ونتائج مرتب ہوتے ہیں، اِن کا علم ترجمہ پڑھنے والوں کو تو کبھی نہیں ہو سکتا، حالانکہ قرآن فہمی کے لیے ان کا بھی جاننا ضروری ہے، کیونکہ بہت سی ہدایتوں کا ان سے تعلق ہے۔ قرینہ و محلِ استعمال سے امتیاز پیدا ہوتا ہے، مثلاً 'مسجدِ حرام' کے معنی 'مسجدِ محترم' اور 'اَکلِ حرام' کے معنی 'ناجائز ممنوع کھانا'۔ ''قرء'' کے معنی حیض وطہر دونوں ہیں، نکاح کے معنی عقد ومباشرت دونوں ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

مترجم کوئی ایک معنی لکھے گا، مگر ترجمہ پڑھنے والے دوسرے معنوں کے اثرات سے ناواقف رہیں گے۔ اور اگر دونوں معانی لکھے جائیں، تو غیر عربی دانوں کو اُلجھن ہو گی، پھر ایک جگہ کسی ایک معنی کے تعین کے لیے جو قرائن ہیں، وہ ترجمہ پڑھنے والوں کو قطعاً معلوم نہیں ہو سکتے۔

اس لیے قرآن فہمی کے لیے شرطِ لازم ہے کہ انسان سب سے پہلے کلماتِ قرآنی کی مکمل تحقیق عربی قواعد ولغت کی روشنی میں کرے اور عربی زبان کا کامل علم حاصل کرے۔ عربی سے ناواقفیت لوازمِ قرآن سے ناواقفیت یا ان کا ناتمام علم، قرآن فہمی سے محروم رکھے گا۔

قومی اثرات کے علاوہ تمام موجودات ذات وصفات کے اعتبار سے باہم متمائز ہوتے ہیں۔ ہر فرد کے افکار واعمال اس کی اپنی نفسیات کے آئینہ دار ہیں۔ کوئی کلام جو متکلم کی اپنی نفسیات کا آئینہ دار تھا، ترجمہ کے بعد مترجم کی نفسیات سے متأثر ہو جاتا ہے۔ اس طرح دو جداگانہ شخصیتیں بیک وقت ایک مرکز پر مجتمع ہو کر متوافق ومتخالف اثر ڈالتی ہیں، ترجمے میں اصل کلام کی وحدانیت باقی نہیں رہ سکتی اور اصلی کلام کے ذریعے متکلم کے مافی الضمیر تک پہنچنے کے جو امکانات اور سہولتیں ہیں، وہ بہر حال ترجمے کی صورت میں موجود

نہیں ہیں، کیونکہ اب سامع پہلے مترجم کے مافی الضمیر تک پہنچنے کی راہ تلاش کرتا ہے، اس کے بعد اصل متکلم کے خیالات تک رسائی کی اُمید رکھتا ہے۔

اور یہ ناممکن نہیں ہے کہ مترجم کے اثرات اس حد تک غالب رہیں کہ منزل تک پہنچنے کے بعد بھی مخاطب اصل کلام کی بعض خوبیوں سے ناواقف رہ جائے۔ اور یہ توسط و پیچیدگی راست روی میں حائل رہے۔

کسی بلند پایہ شاعر کا کلام چند ادیبوں کے سامنے پیش کیجیے، اکثر دیکھا گیا ہے کہ ہر شخص اپنی نفسیات کی روشنی میں اس کی شرح کرتا ہے۔ ان شرحوں میں سے آپ جس ایک شرح کو قبول کرتے ہیں، حقیقتاً اس شارح کی نفسیات کے ساتھ قبول کرتے ہیں اور ممکن ہے کہ شاعر کی اپنی مراد اس معہود شارح سے الگ ہو۔ بلکہ دوسرے شُراح کے موافق ہو، مگر آپ اپنے تاثر و قبول کی وجہ سے حقیقت سے دور رہ جائیں اور شارحِ خاص کی نفسیات کے شکار رہیں۔

یہی وجہ ہے کہ موجودہ اناجیل کو حذف والحاق سے محفوظ بھی تسلیم کرلیں، پھر بھی ہدایتِ خلق کے لیے ناقص وناکافی ہیں، کیونکہ کتابِ مقدس کا اصل متن تو مفقود ہے، مگر ترجمے میں مترجمین کی اپنی نفسیات نے جگہ بنالی ہے۔ ایسا ممکن ہے کہ کمالِ اِخلاص کے باوجود اہلِ انجیل مسیح علیہ السلام کی مراد تک کبھی نہ پہنچ سکیں اور مترجمین کے اثرات سے متأثر ہو کر منزلِ مقصود سے دور رہ جائیں۔ اناجیل کے سلسلہ میں مترجمین پر یوں بھی اعتبار نہیں کیا جاسکتا کہ اگر یہ تراجم حرف بحرف صحیح ہیں، تو مسیحیوں نے اصل متن کہاں اور کیوں چُھپا دیا اور اگر مطابق اصل نہیں، تو قطعاً قابلِ قبول نہیں ہیں۔ انجیل کا پہلا ترجمہ یونانی میں ہوا، اور پھر یونانی زبان کی وساطت سے دنیا کی دوسری زبانوں میں ترجمہ کا سلسلہ قائم ہوگیا۔ اور ہر دور کے مترجم کی نفسیات سے یہ الہامی کتاب متأثر ہوتی چلی گئی، مثلاً سیّدنا موسیٰ علیہ السلام نے

بشارت دی تھی کہ فاران کے مقدس نبی دس ہزار پاک نفوس کی رفاقت میں تشریف لائیں گے۔ انگریزی بائیبل میں یہ اعلان آج بھی اس معینہ عدد کے ساتھ موجود ہے[۳۲]، لیکن انگریزی سے اردو ترجمہ کے وقت بعض مسیحیوں نے دس ہزار کی جگہ لاکھوں لکھ دیا[۳۳]۔ اور اس ادنیٰ فرق سے بات کہاں پہنچ گئی۔ اس طرح مخلص مسیحیوں نے اپنے دین کے تحفظ کے لیے ایک نئی دیوار کھڑی کر دی اور قبولِ اسلام کا دروازہ اپنے لیے بند کر دیا۔ ورنہ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ فتحِ مکّہ یعنی: وادیِ فاران میں داخلے کے وقت حضور اکرم ﷺ کے ہم رکاب دس ہزار صحابۂ کرام تھے، جن کی پاک نفسی وقدوسیت کی گواہی گذشتہ آسمانی کتابوں کے علاوہ قرآن مجید میں موجود ہے۔

کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ مترجم متکلم کی جداگانہ نفسیات پر پیمبرانہ تفسیریں بھی ناقص ہو جائیں گی، کیونکہ حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام بلا شبہ زبانِ قدرت ومترجم

۳۲۔ ملاحظہ ہو: New King James Version، جس میں کلمات یوں ہیں:

"Now this is the blessing with which Moses the man of God blessed the children of Israel before his death. 2 And he said: The Lord came from Sinai, And dawned on them from Seir; He shone forth from ***Mount Paran***, And He came with ***ten thousands of saints***; From His right hand Came a fiery law for them. (Deuteronomy 33: 1-2).

۳۳۔ مذکورہ عبارت کا اردو ترجمہ یوں کیا گیا ہے:

"(۱)اور مَردِ خُدا مُوسیٰ نے جو دُعایِ خیر دے کر اپنی وفات سے پہلے بنی اِسرائیل کو برکت دی وہ یہ ہے (۲)اور اُس نے کہا: خُداوند سِینا سے آیا اور شعیر سے اُن پر آشکارا ہوا۔ وہ **کوہِ فاران** سے جلوہ گر ہوا اور **لاکھوں قُدسیوں** میں سے آیا۔ اُس کے دہنے ہاتھ پر اُن کے لئے آتشی شریعت تھی"۔ (ملاحظہ ہو: 'کتابِ مقدس'، کتاب استثنا، باب ۳۳: آیت: ۱۔۲)۔

کلام الٰہی ہیں۔ مگر اللہ کے حکم کے مطابق حضور کی ذات متبوعِ حقیقی اور مُطاعِ اصلی ہے، آپ مستقل مرکزِ ہدایت و منبعِ دین ہیں۔

سُنّت کی اہمیت

ترجموں کے نقص و خامی کی تفصیل کے علاوہ ہم یہ بتا آئے ہیں کہ کسی کلام کو سمجھنے کے لیے ایک دوسری بنیادی شرط اور بھی ہے، یعنی متکلم نے اپنے کلام کی خود کوئی تشریح کی ہو یا کسی کو تعلیم دے کر تشریح کا ذمہ دار بنا دیا ہو، ان صورتوں میں کلام کا صحیح مفہوم وہی ہو گا، جو متکلم یا اس کے نامزد نمائندے سے منقول ہے۔ اب اس کلام کو صرف لغت کی بنا پر سمجھنا غلط ہو گا، کیونکہ اس کی حیثیت اصطلاحی کلام کی بھی ہو گئی۔ لہٰذا لغوی و اصطلاحی دونوں اعتبار سے اس کلام کو سمجھنا چاہیے۔ قرآن مجید عربی زبان میں نازل ہوا ہے، سلاستِ بیان و ادبِ لغت کے اعتبار سے یہ بہت آسان کلام ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

”بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ“[۳۴] نہایت صاف و سلیس عربی میں۔

دوسری جگہ ہے:

”قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ“[۳۵] یعنی اعلان خداوندی ہے کہ قرآن مجید کو عربی میں اس لیے نازل کیا کہ تم اس کو آسانی سے سمجھ سکو۔

جو شخص قرآن کی اصل زبان سے ناواقف ہو، وہ منشائے الٰہی کے مطابق قرآن مجید کو کامل طور پر کیونکر سمجھ سکتا ہے۔۔۔! کاش مدعیانِ قرآن فہمی ان آیات پر ایمان

۳۴؎ الشعراء ۲۶: (۱۹۵)۔

۳۵؎ یوسف ۱۲: (۲)۔

لے آئیں، تو پھر عربی داں علمائے قرآن کی توہین و تنقیص کے بدلے ان کی گراں بہا دینی خدمات کے معترف ہوں۔

قرآن مجید کی پیغمبرانہ تشریحات

قرآن مجید کی بعض آیات کی تفسیر خود متکلمِ حقیقی نے بیان کی ہے، جن کی واقفیت کلام فہمی کے مسلمہ ضابطے کے مطابق ہر متدبرِ کلامِ الٰہی پر لازم ہے۔ دوسری اہم بات اس سلسلے میں یہ ہے کہ حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیثیت صرف یہی نہیں ہے کہ ہرکارہ پیغام رساں کی طرح اللہ تعالیٰ کے احکام بندوں تک پہنچا دیں اور بس۔ اگر بعثتِ انبیاء سے یہی غرض تھی کہ اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان ڈاکیوں کی ایک جماعت پیدا کی جائے اور بندگانِ خدا ان پیغاموں کو خود سمجھ لیا کریں، تو یہ کام ان ہرکاروں کے بغیر بھی انجام پا سکتا تھا۔ اور جس طرح عقلِ انسانی نوامیسِ فطرت کی دریافت میں کسی ماورائے انسانی رہنمائی کی محتاج نہیں ہے، بلکہ پیش آنے والی تمام گتھیاں خود پیدا کرتی ہے اور کسی اور طاقت کے بغیر خود ہی سلجھاتی ہے۔ اگر مسائلِ دینیہ بھی اسی قبیل سے ہوتے اور انسان عقل و فہم میں خود مکتفی ہوتا، تو پھر عالمِ مادہ کی طرح روحانیت کا تعقل بھی فطرتاً اس کے سپرد ہو جاتا۔ جانوروں کی طرح اپنی خبرت سے اللہ کی سخط و رضا اور رحم و غضب کو معلوم کر لیا کرتا، لیکن واقعات و مشاہدات ہمیں بتاتے ہیں کہ مادیات کی حدود میں انسانی صلاحیتیں ناکامی سے کامیابی کی طرف یوماً فیوماً بڑھتی جا رہی ہیں۔ ایک کی غلطی کی تصحیح دوسرا فرد کر دیتا ہے۔ عناصر کی شکست و ریخت اور جمع و ترکیب کی حد تک انسان بڑا قادر و توانا ہے، مگر روحانیت کے مسائل میں اس کی عقل کچھ ایسی کوتاہ دست و سُست قدم ہے کہ دوسروں کی رہنمائی کے بغیر آگے بڑھتی نظر نہیں آتی۔ بڑے سے بڑا فلسفی و سائنس داں جب مادی ادراک

کے منازل طے کرکے روحانیت کی سرحد پر جا کھڑا ہوتا ہے، تو روح کی اہمیت اور خدائے کائنات کے اقرار میں اس کی گردنیں جُھک جاتی ہیں، مگر اللہ رے بے بسی! از خود انسان وخدا کے درمیان رشتے کا سُراغ لگانے سے بالکل مجبور ہے۔ (تفصیل کے لیے میرا مضمون ''دہریت اور اس کی ایڈیالوجی'' ملاحظہ فرمایئے[۳۶]) یہی وہ نقطہ ہے، جہاں بہت ہی بالغ نظر انسان بھی مذہب و معلمِ مذہب کا محتاج ہی نظر آتا ہے۔

قرآن و مطالعۂ فطرت

خالقِ کائنات کا ارشاد ہے کہ ہم نے کوئی چیز عبث و بیکار نہیں پیدا کی ہے[۳۷]۔ اہلِ نظر و صاحبِ ایمان کا فرض ہے کہ اپنے فکر و عمل کو کام میں لائیں۔ ان سے استفادہ کریں اور خلاّقِ ارض و سما کے شکر گزار ہوں، آفاقی آیتوں کے متعلق اللہ جل و علیٰ نے اجمالی حکم دے کر ان کی تفصیل و تشریح اور استفادہ و انتفاع کا کام خود ہمارے سپرد کر دیا ہے، جوں جوں ضرورتیں پیدا ہوتی ہیں، عقلِ ادراک اس وسیع خزانۂ فطرت سے اپنی کفالت کا سامان مہیّا کر لیتی ہے۔ جو حاجتیں آج ہیں، ان کی تکمیل کے اسباب بھی آج ہی ظاہر ہوتے ہیں۔ عصرِ حاضر کی ایجادات کا سراغ ایک ہزار سال پہلے تلاش کرنا اسرارِ فطرت سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ اسی طرح ہزار سال بعد جب انسانی ضروریات بہت کچھ بدل چکی ہوں گی۔ اُس وقت آج کے مہیّا کردہ سامان کی کوئی قیمت نہیں رہے گی۔ اصطلاحِ تمدن میں جس کا نام ترقی ہے، ''وہ تکمیلِ ضرورت'' کے سوا اور کوئی چیز نہیں، اپنی ضروریات و تکمیلِ ضروریات کے

---

[۳۶] بہت کوشش کے باوجود تادمِ تحریر یہ مضمون نہیں مل سکا، ممکن ہے اللہ تعالیٰ کوئی راہ نکال دے۔ محقق

[۳۷] ملاحظہ ہو: المؤمنون ۲۳: (۱۱۵)، وسورۂ ص ۳۸: (۲۷)۔

لحاظ سے ہر دور ترقی کا دور ہے۔ دوسروں لفظوں میں ہر دور اپنے ماضی کی نسبت سے شاندار اور مستقبل کے اعتبار سے پست و تاریک ہے، گویا ترقی حاجتوں کی فراوانی کا دوسرا نام ہے۔ ہونا بھی یہی چاہیے کیونکہ انسان سراپا احتیاج ہے اور حاجتوں کے ظہور سے انسان کے تمام کمالات وابستہ ہے۔

جو لوگ مذہب کی غرض صرف مادی ترقی قرار دیتے ہیں وہ بڑی غلطی میں ہیں۔ روح و مادہ کے فرق کو نہیں سمجھے اور دونوں کی حدود سے غافل ہیں۔ مادّی ترقیات روح و خدا کے انکار کے بعد بھی ہو سکتی ہیں، کیونکہ ان مسائل میں عقلِ انسانی خود مکتفی ہے۔ ضروریاتِ انسانی ان کے لیے محرک اور میدانِ عمل بہت وسیع ہے۔ مگر روح و مذہب کے معاملے میں انسانی دراز دستیاں ناکارہ، عقل ناکام اور میدانِ عمل نامعلوم ہے۔ یہاں اقرارِ خدا اور معلمِ مذہب کے اتباع سے مفر نہیں۔ اسی لیے قرآن مجید مطالعۂ فطرت پر زور دینے کے بعد بھی اس کی کوئی تفصیل نہیں بتاتا اور نہ کبھی کوئی معلمِ مذہب یعنی پیغمبر و رسول طبیعات و کیمیا کی تعلیم کے لیے مبعوث ہوئے۔ اس کے برخلاف فطرت کے اجمالی احکام دے کر عقائد و اعمالِ مذہب کی تفصیلات بیان کرنے کی ذمہ داریاں ان کے سپرد ہیں۔

فریضۂ رسالت

روح و مادہ کا بنیادی فرق معلوم کرنے کے بعد تمام باہوش انسانوں کا فرض ہے کہ مذہب کا صحیح علم حاصل کرنے کے لیے اللہ کے فرامین و احکام کی طرف متوجہ ہوں اور جو کچھ کلامِ الٰہی کے نام سے انسانوں کے پاس موجود ہے، اس کو سمجھیں اور اسی کے مطابق عمل پیرا ہوں۔ چونکہ دنیا میں اللہ کے کلام کا صحیح و اصلی مجموعہ صرف 'قرآن مجید' ہے، دوسری الہامی کتابیں تاریخی حیثیت سے مشتبہ، حذف و الحاق کی شکار اور بے اصل ہیں، یعنی

اصل متن ناپید ہے اور ترجمہ در ترجمہ ہو کر ہم تک پہنچی ہیں۔ ان کتابوں سے تشنہ کام دل کو تسکین نہیں مل سکتی، لہٰذا بنی نوع انسان کو چاہیے کہ قرآن مجید کا مطالعہ کرے اور اپنی مذہبی پیاس اسی آبِ زُلال کے سرچشمے سے بجھائے۔

قرآن مجید کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے دنیا کے اور دوسرے کلاموں کی طرح ان تمام شرائط کا پورا پورا لحاظ رکھیں، جو کسی کلام کے فہمِ معانی کے لیے ضروری ہیں۔ اولاً لسانِ قرآن، یعنی عربی زبان سے صحیح واقفیت۔ دوسری اہم تربات یہ ہے کہ اگر متکلم نے کسی کو تعلیم دے کر اپنے کلام کی تشریح و توضیح کا ذمہ دار بنا دیا ہے، تو اب اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ مخاطبین اس کلام کا وہی مفہوم قبول کریں، جو متکلم نے خود بیان کیا ہے، یا اس کے سکھائے ہوئے نمائندے نے وضاحت فرمائی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ کسی کلمہ کے معنی لغت کے اعتبار سے کچھ اور ہوں، لیکن متکلم کی مراد وہ اصطلاحی معنی ہیں، جو اس نے خود متعین کیے ہیں۔

چنانچہ قرآن مجید کے ساتھ حضور اکرم ﷺ کا دو گونہ تعلق ہے، اوّل تو یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا کلام آپ پر نازل ہوا، تاکہ آپ بعینہٖ دوسروں تک پہنچا دیں: بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ [۳۸] یہ اور اس مضمون کی متعدد آیتیں ہیں، جن میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے حبیب و رسول علیہ السلام کو حکم دیا کہ قرآن مجید جوں کا توں تمام لوگوں کو پہنچا دیجیے۔ آپ پر تبلیغِ کلامِ الٰہی فریضۂ اوّلین ہے۔

۳۸۔ المائدۃ۵: (۶۷)۔

دوسری حیثیت یہ ہے کہ حاملِ قرآن بنانے کے علاوہ اللہ جل شانہٗ نے آپ کو قرآن کی تعلیم بھی عطا فرمائی، علم القرآن یعنی اپنے کلام قرآن مجید کے معانی مطالب آپ کو سکھائے اور پھر اپنی طرف سے آنحضرت ﷺ کو یہ ذمہ داری سپرد کی گئی کہ لوگوں تک اللہ کے کلام کو پہنچائیں اور اس کے معانی کی وضاحت فرمائیں:

"وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتَابَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَيْهِمْ"[39] (ہم نے آپ پر قرآن مجید اتارا، تاکہ آپ لوگوں کے سامنے اس کی توضیح و تشریح فرمائیں)

اس طرح شرح و بیان کی ذمہ داریاں سپرد کرکے اللہ جل وعلیٰ نے اپنے اس رحیمانہ وعدے کو پورا کیا جو: "ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ"[40] (پھر قرآن مجید نازل کرنے کے بعد اس کی وضاحت وبیان کی ذمہ داری بھی ہمیں پر ہے) میں مذکور ہے۔ رسول اکرم ﷺ کی ساری توضیحات لاریب اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور حضور قرآن و مطالبِ قرآن حکمِ الٰہی کے مطابق بندگانِ خدا تک پہنچاتے رہے اور پہنچا دیا، اور جو کچھ بھی آپ سے اس سلسلے میں ظاہر ہوئے، وہ کلام ربانی کی تشریح و توضیح ہے۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے دین سے متعلق جو دو اُمور آپ کے سپرد کیے تھے، یعنی: تبلیغِ قرآن اور تشریحِ کلام الٰہی، ان میں سے حضور اقدس ﷺ نے صرف ایک پر عمل کیا اور قرآن مجید کی تشریح نہیں فرمائی۔ حق تو یہ ہے کہ آپ نے حقِ رسالت ادا کر دیا، قرآن بھی عطا کیا اور قرآن مجید کی شرح یعنی اپنی ساری زندگی، جس کو سنت واُسوہ سے تعبیر کرتے ہیں، خلقِ خدا کی ہدایت کے

---

[39] النحل١٦: (٤٤)۔

[40] القیامۃ٧٥: (١٩)۔

لیے پیش کر دی۔ سنت قرآن مجید کی پیغمبرانہ شرح وبیان کا نام ہے، جو آیات قرآنی سے الگ مگر ان سے متعلق ہیں کیونکہ "ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ"[۱۴۱] (پھر قرآن مجید کے معانی کی وضاحت ہم پر ہے) میں بیان کی اضافتِ ضمیر راجع بجانب قرآن کی طرف ہے، جس کے معنی ہوئے کہ قرآن اور چیز ہے اور قرآن کا بیان اور چیز ہے اور دونوں اللہ کی طرف سے ہیں۔

لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ میں یہ بتادیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدۂ تبیین کی ذمّہ داری حضور اکرم ﷺ کے سُپرد کر دی ہے اور آپ جو کچھ قرآن مجید کی تشریح فرمائیں گے، وہ اگرچہ قرآن کا حصّہ نہیں ہے، مگر سر تا سر اللہ کی طرف سے وحی والہام کے مطابق ہے اور یہ بیان دنیا کو حضور اکرم علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے اقوال واعمال سے حاصل ہو رہا ہے اور خود آنحضرت ﷺ کو اللہ کی طرف سے عطا ہوا۔ یہی اس آیت کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے بتادیا کہ قرآن مجید کے علاوہ آپ ﷺ کی زبانِ مبارک سے جو غیر معجزانہ کلام ظاہر ہوتے ہیں، اُن کا مدار بھی کلامِ الٰہی ہے اور کسی کو شک واختلاف کا حق نہیں ہے۔

❁ ..... ❁ ..... ❁ ..... ❁

۱۴۱؎ القیامۃ۷۵: (۱۹)۔

باب دوم

"فہمِ قرآنی اور نُورِ نبوّت"

(تشریحاتِ قرآنی، حدیث کی اصلاح، سُنّتِ رسول ﷺ اور اس کی اہمیّت)

ہم بتا چکے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے قرآن مجید کے ساتھ اللہ کی طرف سے اس کی تفسیر بھی دنیا والوں کو عنایت فرمائی اور اس باب میں حضور اکرم ﷺ سے جو کچھ بھی منقول ہو گا، وہ سب کا سب قرآن فہمی کے لیے لازم ولابُدی ہو گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے کلام کی تشریح کا حق حضور ﷺ کو تھا اور اللہ کی طرف سے حضور ﷺ اس کے ذمے دار بنائے گئے تھے۔ آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قرآن مجید کی تشریح تین طرح پر فرمائی: اوّل اقوال، دوم افعال اور سوم تقریر، یعنی آپ نے زبانِ مبارک سے حکم دیا کہ فلاں کام کرو اور ان دوسرے کاموں سے باز رہو۔ اسی کو اصطلاحِ شریعت میں قولی سنّت وقولی حدیث کہتے ہیں۔ دوم یہ ہے کہ آپ نے صحابۂ کرام کے سامنے کوئی کام کیا، جسے صحابۂ کرام دیکھ کر خود عمل کرنے لگے اور دوسروں کو آنحضرت ﷺ کے اس مقدس عمل سے باخبر کیا۔ تیسری صورت یہ تھی کہ درس گاہِ نبوت کے کسی طالب العلم نے کوئی کام کیا اور آپ ﷺ نے ان کو منع نہیں فرمایا، تو سمجھا یا گیا کہ یہ کام درست تھا، ورنہ اپنے کسی جاں نثار متعلم کو غلط روی سے آپ فوراً روک دیتے یا خبر دار کرتے۔ اسی شرحِ دین وبیانِ قرآن کا نام 'سنت' ہے اور اس سنت کی مذکورہ تین قسمیں[۴۲] ہیں۔ ازمنۂ سابقہ میں کسی

---

[۴۲] **تین قسمیں:** ۱۔ قولی: حضور ﷺ کا فرمانِ مبارک۔ ۲۔ عملی: حضور ﷺ کے اعمالِ مبارکہ۔ =

مسلمان نے سنتِ نبوی کا انکار تو نہیں کیا، لیکن عہد حاضر کے چند فرنگی مُلّا[۴۳] اس کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہیں۔

حدیث کی اصطلاح

سنّت، قرآن مجید کے بیان کا دوسرا نام ہے۔ حضور اکرم ﷺ کے اقوال واعمال اور تقریرات کو صحابہ و تابعین جب اپنی زبان میں قرآن مجید سے علیحدہ بیان کرتے ہیں، تو ان کو 'حدیث' سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ لفظ 'سنت' کے مفہوم میں عمل ورواج کو زیادہ دخل تھا۔ اقوال و تقریرات اس سے نکل جاتے تھے، حالانکہ مطالبِ قرآنی کے کشف وبیان وہ بھی ہیں، اس لیے مفہوم میں وسعت دینے کے لیے 'حدیث' کا لفظ اختیار کیا جو وسیع المعنی ہے۔ اب ہر وہ روایت جس کا تعلق حضور اکرم ﷺ کے اقوال واعمال یا تقریر سے ہو، وہ 'حدیث' کہلائے گی۔

سنّتِ رسول ﷺ اور ہمارا فرض

جس طرح حضور اکرم ﷺ کی ذات قرآن سے علیحدہ نہیں کی جاسکتی۔ قرآن ومہبطِ[۴۴] قرآن دونوں پر ایمان لانا رُکنِ اسلام ہے، اسی طرح پیغمبرِ اسلام ﷺ کی ذات گرامی سے ان کی مقدس زندگی کے تابندہ نقوش کی علیحدگی ناممکن ہے، دنیا نے قرآن

=

۳۔ تقریری: حضور اکرم ﷺ کے سامنے یا ان کے علم میں صحابہ کا کوئی عمل آیا، مگر حضور ﷺ نے اس سے منع نہ فرمایا۔ ۱۲ منہ

۴۳۔ اس میں منکرینِ حدیث کے 'بڑے' کی طرف اشارہ ہے۔ محقق

۴۴۔ مہبطِ قرآن: جن پر قرآن نازل ہوا۔ ۱۲ منہ

آنحضرت ﷺ سے سیکھا، لیکن حضور نے براست اللہ تبارک وتعالیٰ سے قرآن مجید کی تعلیم پائی۔ اللہ کے معصوم پیغمبر کے لیے جائز نہ تھا کہ منشائے الٰہی کے خلاف کلامِ ربانی کی شرح فرمائیں اور نہ دنیا والوں کے لیے جائز ہے کہ منشائے نبوت سے الگ قرآن مجید کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

متکلمِ حقیقی اللہ تبارک وتعالیٰ کے کلام کا مفہوم جو حضور اکرم نے بتایا ہے، وہی اصل و صحیح ہے۔ کسی کا یہ کہنا کہ اللہ جل شانہٗ نے قرآن مجید تو نازل فرمایا مگر: ''ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ''(پھر ہمارے ہی ذمے اس قرآن کی تشریح بھی ہے) کا وعدہ پورا نہ ہوا، غلط ہے معاذ اللہ! ذات پاک پر بدعہدی کا الزام لگانا ہے لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ کے اعلان نے قرآن مجید کے بیان وکشف کے حق دار سے ہمیں آگاہ کر دیا۔

قرآن مجید ھدًی لِلنَّاسِ ہے، یعنی یہ کتابِ ہدایت قیامت تک کے تمام انسانوں کے لیے خدا کا آخری ہدایت نامہ ہے، اس لیے نہ تو اللہ کا مقدس کلام معدوم ہو سکتا ہے اور نہ اس کلام کی وہ صحیح تفسیر ہی ناپید ہو سکتی ہے، جو حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سنّت واُسوہ کے نام سے دنیاوالوں کو عطا فرمائی۔ وہ دوا ازالۂ مرض کے لیے ناکافی ہے، جس کے ساتھ حکیم حاذق کی بتائی ہوئی ترکیب نہ ہو، ''وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ''[۴۵] ناممکن ہے۔ قرآن تو قیامت تک محفوظ رہے، مگر اس کی پیمبرانہ شرح گم ہو جائے، گویا اللہ کے وعدۂ ہدایت میں فرق آگیا۔

۴۵؎ بنی اسرائیل ۱۷: (۸۲)۔

"اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ"[46] (کتاب ہدایت ہم نے نازل کی اور بے شک ہمیں اس کے محافظ ہیں)۔

قرآن مجید کا دنیا میں بطور ذکر وہدایت محفوظ رہنے کے لیے ضروری ہے کہ قرآن اپنے تمام متعلقات کے ساتھ محفوظ رہے، یعنی عربی زبان، عربی قواعد اور سنتِ رسول علیہ السلام بھی قرآن مجید کے ساتھ تاابد قائم رہیں گے۔

قرآن اور بیانِ قرآن یعنی سنّتِ نبوی کو محفوظ و تابناک بنا کر اللہ جل وعلیٰ نے تمام لوگوں کو حکم دیا کہ "اَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَاَطِيۡعُوا الرَّسُوۡلَ"[47] (یعنی: کلامِ خدا کو قبول کر کے اللہ کی اطاعت کرو اور سنتِ رسول پر عمل کر کے رسول کی اطاعت کرو) دونوں اطاعتوں میں اگرچہ خدائے واحد ہی کی فرمانبرداری ہے، لیکن کلامُ اللہ و سنت یعنی کلامِ رسولُ اللہ میں ظاہری نسبت کا فرق تھا، ایک معجزانہ کلام ہے، جس کے مقابلے سے دنیا عاجز رہی، دوسرا غیر معجزانہ کلام ہے۔ ایک ظاہری وحی اور دوسری معنوی وحی ہے۔ قرآن کے ساتھ ساتھ جہاں اللہ نے اتباعِ رسول کا حکم دیا، وہاں بالاستقلال سنّتِ رُسول کی اہمیت ظاہر فرمائی: "لَقَدۡ كَانَ لَكُمۡ فِىۡ رَسُوۡلِ اللّٰهِ اُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ"[48] یعنی: حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پوری زندگی ہمارے لیے تقلیدی نمونہ ہے، اور اللہ کی محبت کا صحیح راستہ یہ ہے کہ ہم سب حضور اکرم کے نقش قدم پر چلیں اور ان کی قائم کردہ سنّت سے اِدھر اُدھر نہ مڑیں۔ "اِنۡ

---

٤٦ الحجر ١٥: (٠٩)۔

٤٧ النساء ٤: (٥٩)۔

٤٨ الاحزاب ٣٣: (٢١)۔

كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللهُ"[49]، "لوگو! اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو، تو میری پیروی کرو، محبوب خدا بن جاؤ گے"۔

حضور اکرم علیہ السلام نے آیاتِ قرآنیہ کی خاموش وضاحت نہیں فرمائی، بلکہ زبان مبارک سے صریح حکم بھی دیا اور عمل کرکے لوگوں کو بتایا کہ منشائے الٰہی یہی ہے، مثلاً: "صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ"[50]، یعنی: اللہ کے حکم: "اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ" کی تفسیر یہی ہے کہ میری طرح نماز ادا کرو۔

اسی طرح کھانے پینے کے مسائل میں اللہ تبارک و تعالیٰ کے اس حکم: "يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ" کی تشریح فرمائی اور منشائے قدرت میں جو چیزیں گندی اور بُری تھیں، وہ آپ نے بتادیں۔

"وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ"[51] (نماز ادا کرو اور زکوٰۃ دو اور رسول کی فرماں برداری کرو، اس طرح تم رحمت کے امیدوار ہو سکتے ہو)۔

نماز کی پابندی کے بعد جب کہ انسان اللہ سے اپنا رشتہ درست رکھے اور زکوٰۃ کے ذریعہ اپنے ہم جنسوں کے حقوق ادا کر رہا ہو، اطاعتِ رسول کے معنی اس کے سوا اور کیا ہیں کہ کتابُ اللہ حاصل ہو جانے کے بعد بھی ہم اتباعِ رسول یعنی اطاعتِ سنت سے مستغنی نہیں ہو سکتے۔

---

[49] آلِ عمران ۳: (۳۱)۔

[50] ملاحظہ ہو: 'صحیح البخاری'، ج۱، ص۱۲۸، رقم: ۶۳۱، و'سنن الدارمی'، ج۲، ص۷۹۶، رقم: ۱۲۸۸۔

[51] النور ۲۴: (۵۶)۔

دوسری جگہ ارشاد ہے کہ

"فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ"[۵۲] (لوگوں کو ڈرتے رہنا چاہیے ایسا نہ ہو کہ رسول کے حکم کی مخالفت کر بیٹھیں فتنہ میں مبتلا ہو جائیں گے اور درد ناک عذاب میں گرفتار ہوں گے۔

یہ آیت منکرینِ سنت کے حق میں بڑی واضح ہے، جو کتابُ اللہ کو تو مانتے ہیں مگر احکامِ رسول کی مخالفت کرتے ہیں، حالانکہ اللہ نے کہہ دیا ہے: "فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا"[۵۳] (رسول کی پیروی کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو) اور یہی اصلِ دین ہے۔

سنّتِ رسول علیہ السلام سے انکار قرآن مجید سے انکار ہے

آپ قرآن مجید کی احکامی آیتوں کو پڑھ جایئے۔ اگر ان پر پوری صداقت واخلاص سے عمل کرنا چاہیں، تو یہ اسی وقت ممکن ہو گا جب کہ آپ حدیثوں کی بیان کردہ تفصیلات کو ساتھ ساتھ قبول کریں، ورنہ قرآن کے اجمالی احکام آپ کی سمجھ میں نہیں آسکتے، مثلاً صلوٰۃ، صوم، حج، زکوٰۃ، اگرچہ یہ تمام الفاظ عربی زبان کے ہیں، مگر اللہ کے کلام میں اصطلاحی (تعینِ راہِ حق) بن کر آئے ہیں۔ ان کی تفسیر حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنّت میں ملے گی۔ یہ اجمال صرف عبادات میں نہیں ہے، بلکہ دیگر تمام احکامی آیتوں میں بھی ہے، مثلاً ارشاد ہوتا ہے کہ

۵۲؎ النور ۲۴: (۶۳)۔

۵۳؎ الانعام ۶: (۱۵۵)۔

"السَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا"[54] چوروں کے ہاتھ کاٹ دو۔

'کہاں تک ہاتھ کاٹا جائے؟' اسکی تفسیر صرف حضور ﷺ کے قول و عمل سے ممکن ہے، کیونکہ متکلم ہی کو حق ہے کہ اپنے کلام کی شرح بیان کرے یا پھر اس کا نامزد نمائندہ۔

خلاصۂ مقصد

چونکہ کلامُ اللہ حضور پر نازل ہوا اور آنحضرت اس کی تبلیغ اور توضیح کے ذمے دار تھے۔ اس لیے جب تک کوئی شخص آنحضرت سے قرآن اور قرآن کی توضیح یعنی: سنت قبول نہیں کرے گا، اللہ کے حکموں پر نہیں چل سکتا اور چونکہ قیامت تک اسلام خدا کا پسندیدہ دین ہے، اسلام کی دونوں بنیادیں یعنی قرآن و سنّت محفوظ رہیں گی۔ رہا کسی فرنگی مُلا کا انکارِ حدیث تو بہر حال شپرہ چشمی[55] سے آفتاب بے نور نہیں کہلا سکتا۔

آج انکارِ حدیث کے فتنے سے مؤمنین کے ایمان میں مزید جلاء و قوت پیدا ہو گئی ہے اور حضور اکرم ﷺ کی صداقت پر ایک دلیل کا اضافہ ہو گیا۔ آنحضرت ﷺ نے آج سے چودہ سو سال پہلے اس گروہ کے ظاہر ہونے کی خبر دے دی تھی، جو کُتبِ حدیث میں موجود ہے جس کا جی چاہے ابو داود و ترمذی کے کسی نسخے کو اٹھا کر دیکھ لے۔

قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «يُوشِكُ رَجُلٌ مِنْكُمْ مُتَّكِئًا عَلَى أَرِيكَتِهِ يُحَدَّثُ بِحَدِيثٍ عَنِّيْ، فَيَقُولُ: بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ كِتَابُ اللهِ فَمَا وَجَدْنَا فِيهِ مِنْ حَلَالٍ

---

[54] المائدۃ۵: (۳۸)۔

[55] شَپَّرہ چشم: سورج کی روشنی میں آنکھیں بند رکھنے والا، چمگادڑ۔ کنایۃً وہ شخص جو صاف اور واضح حقیقت کو تعصب کے باعث نہ دیکھ سکے۔ (ملاحظہ ہو: 'اردو لغت'، مادہ: شپّر ک)

اسْتَحْلَلْنَاهُ، وَمَا وَجَدْنَا فِيهِ مِنْ حَرَامٍ حَرَّمْنَاهُ، أَلَا! وَإِنَّ مَا حَرَّمَ رَسُولُ اللهِ مِثْلُ الَّذِيْ حَرَّمَ اللهُ أَلَا! إِنِّي أُوتِيتُ الْكِتَابَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ» [٥٦]۔

یعنی: ”حضور نے فرمایا ہے کہ مستقبل میں ایک شخص تمھارے درمیان اپنی مسند پر ٹیک لگائے ہوئے ہماری حدیثوں کا ذکر کرے گا اور پھر کہے گا کہ لوگو! ہمارے اور تمھارے درمیان قرآن مجید ہے، اس میں جو کچھ ہم حلال پائیں حلال قرار دیں اور جو کچھ حرام پائیں حرام کر دیں۔ آگاہ ہو جاؤ! اللہ کے رسول نے جو چیزیں حرام قرار دی ہیں، وہ اسی طرح حرام ہیں، جو اللہ کے حرام کرنے سے حرام ہو جائیں۔ خبر دار ہو! بے شک مجھے قرآن ملا اور اس کے ساتھ اسی جیسی اور دوسری چیز بھی“۔

وہ دوسری چیز کیا ہے؟ قرآن مجید کی تفسیر اور دین کی توضیح کا حق۔ ملاحظہ فرمایئے کہ انکارِ حدیث کا فتنہ آج پیدا ہوا ہے، لیکن خدا کی طرف سے ڈرانے والے نے اپنی اُمت کو ڈیڑھ ہزار برس پیشتر آگاہ کر دیا تھا۔ یقیناً یہ پیشین گوئی قرآن میں درج نہیں ہے، لیکن واقع سے صحیح ثابت ہو رہی ہے۔ یہ اس مجموعۂ وحی میں سے ہے، جو قرآن مجید کے علاوہ مگر مثل قرآن کے آپ کو ملا تھا۔ اگر ابدی دین کے لیے صرف قرآن مجید کافی ہوتا، تو پھر نزول قرآن کے لیے ۲۳ سال محنت محض لغو اور فضول تھی، یہ کام چند ہفتوں اور مہینوں میں انجام دیا جا سکتا تھا۔ جس طرح آج کوئی شخص چند مہینوں میں پورا قرآن مجید حفظ کر لیتا ہے، اور چند گھنٹوں میں اس کی تلاوت سے فارغ ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کے لیے بھی نزولِ

۵۶؎ ملاحظہ ہو: ’سنن ابن ماجہ‘، ج ۱، ص ۶، رقم: ۱۲، و’سنن ابو داود‘، ج ۴، ص ۲۰۰، رقم: ۴۶۰۴، و’سنن الترمذی‘، ج ۵، ص ۳۷، رقم: ۲۶۶۳، و’سنن الدارمی‘، ج ۱، ص ۴۷۶، رقم: ۶۰۶۔

قرآن کے سلسلے میں حفظ و تلاوت کی موجودہ مدّت کافی تھی، لیکن یہ واقعہ ہے کہ قرآن کی تعلیم، نزول بتدریج ہوئی اور ۲۳ سال کی طویل مدت میں یہ مقصد پورا ہوا، اس لیے کہ قرآن کتاب کی صورت میں بہت مختصر ہے، مگر جب اس کی پیمبرانہ شرح کی جاتی ہے اور اسوۂ رسول اس کتاب مقدس کا تکملہ بنتا ہے، تو یہی مختصر مجموعہ پھیل کر ۲۳ سال کی طویل مدت کو محیط ہو جاتا ہے۔ نزولِ قرآن کے لیے یہ طویل مدت صرف حدیثوں کی روایت سے قدرت نے تجویز کی۔

گذشتہ تفصیل کے بعد کسی صاحبِ بصیرت کے لیے درست نہیں ہے کہ درایت یا روایت کی بنیاد پر حدیثوں کی اہمیت کا انکار کرے۔ کیونکہ قرآن و سنّت دونوں حقیقتاً اللہ جل وعلیٰ کی طرف سے ہیں، اور دین حق کے اہم اجزا ہیں۔ سنّت تمام قرآن کو محیط ہے بخلاف قرآن مجید زیادہ تر اصولی ہدایت عطا کرتا ہے اور وہ تفصیلات اس میں موجود نہیں ہیں، جو حدیثوں سے حاصل ہوتی ہیں اور انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو گھیرے ہوئے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمادیا کہ حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی کی ذاتِ گرامی سے لوگوں کو دونوں فائدے حاصل ہوں گے تزکیہ و تطہیر اور کتاب وحکمت کا علم۔

"یُزَکِّیۡهِمۡ وَیُعَلِّمُهُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَةَ"[۵۷] یعنی: آپ لوگوں کا تزکیہ بھی کرتے ہیں اور کلام اللہ وحکمت کی تعلیم بھی دیتے ہیں۔

مندرجۂ بالا کسی جگہ اس آیتِ کریمہ کی تفصیل گزر چکی ہے، یہاں اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر اتنا بتادینا ضروری ہے کہ تزکیۂ نفوس اور تعلیمِ کتاب دو جداگانہ

۵۷؎ آلِ عمران ۳: (۱۶۴)۔

امور ہیں، ایک شخص قرآن مجید کو یاد کرلے اور اس کو قرآن کے لغوی معنی پر عبور حاصل ہو، اگر تزکیۂ نفس میّسر نہیں تو وہ ہرگز راہ یاب نہیں ہو سکتا۔ ہمارے سامنے ایسے بیسیوں مستشرقینِ یورپ وایشیا کی مثالیں موجود ہیں۔

کتاب اللہ کی تیز تجلیات سے کبھی انسانی عقل خیرہ ہو کر صحیح راہ سے الگ ہو سکتی ہے اور اس کے حق میں قرآن مجید: ''یَهْدِیْ بِهٖ كَثِیْرًا'' کے بدلے ''یُضِلُّ بِهٖ كَثِیْرًا'' کا اثر پیدا کرتا ہے۔ اگرچہ اس کا امکان بھی ہے کہ صرف قرآن سے وابستگی کسی صالح فطرت انسان کو راہ ہدایت پر قائم رکھے اور ''یَهْدِیْ بِهٖ كَثِیْرًا'' کا وعدہ اس کے لیے ظاہر ہو، لیکن ان دو گونہ خطرات میں راہِ راست حاصل کرنے کے لیے تزکیۂ نفس ایک ایسا نسخۂ کامیابی ہے، جس کی وجہ سے انسان کے لیے گم گشتگی وضلالت کا امکان نہیں رہتا اور تزکیۂ نفس کا سامان حدیثوں میں ہے۔

تزکیۂ نفس، حدیثوں، اتباعِ رسول اور اسوۂ پاک سے حاصل ہوتا ہے۔ اگر قرآن فہمی کے لیے حدیثوں کا سہارا مضبوطی سے پکڑا جائے، تو ہدایت یابی آسان ہوتی ہے۔ حدیثوں کی مدد کے بغیر کسی نے قرآن سمجھنے کی کوشش کی اور صحیح منشائے کلام تک پہنچ گیا، تو یقیناً راہِ ہدایت پر ہے، ورنہ ذہن رسا کی غلطی اور مفہومِ صحیح تک نارسائی کے بعد کسی گمراہ کے سنبھلنے کی کوئی امید نہیں رہتی۔ تعلیمِ کتاب کی صحیح افادیت تزکیۂ نفس پر موقوف ہے، جس نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کو 'صدیق' بنایا اور ابو الحکم کو 'ابو جہل' کا طوقِ لعنت پہنایا۔ جہاں تک کتابُ اللہ کا تعلق تھا، آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بلا تفریق ہر کہ ومہ کے سامنے اس کی تعلیم کا اعلان کر دیا۔ دوست اور دشمن سبھوں نے اقرار کیا کہ یہ بشر کا کلام نہیں ہے، مگر ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اس اعلان کے بعد سنّت کی بھی تصدیق کی اور اتباعِ رسول میں فنا ہو گئے۔

منکرین قبولِ سنّت سے محروم تھے، برباد ہوگئے۔ قبولِ سنّت اور اتباعِ رسول سے ایک کا تزکیہ ہو گیا دوسرا اس نعمتِ عظمیٰ سے بے بہرہ رہا۔ آج بھی کتاب اللہ کے ساتھ قبولِ سنّت نہ ہو، تو وہ تزکیہ حاصل نہیں ہو سکتا، جو مؤمنین پر اللہ کی خاص عنایت ہے۔ وہ تصوف بھی اِلحاقی اور خارج از دین ہے، جس پر سنّتِ نبوی کی مہرِ تصدیق ثبت نہ ہو۔ طریقت، شریعت سے علیحدہ کوئی چیز نہیں اور شریعت، کتاب و سنّت کے مجموعے کا نام ہے۔ اسی لیے صوفیائے کرام کے یہاں وہی شجرۂ بیعت معتبر ہے، جس کی سند حضور علیہ السلام تک متصل ہو۔

باب سوم

”تدوین حدیث“

[۱]

(ابتدائی دورِ کتابت میں قرآن کا مقدم کیا جانا)

بعض لوگوں کو قبول حدیث سے انکار ہے، وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ جمع و تدوینِ حدیث کا کام عہدِ صحابہ میں نہیں ہوا اور عہدِ صحابہ کے بعد بیشتر عجمی نژاد فتنہ پسند اور منافق راویوں نے اپنی طرف سے گھڑ کر حدیثوں کا پشتارا[۵۸] اسلام کی معصوم پیٹھ پر لاد دیا۔ بعض راویوں نے اپنی عظمت کا محل کثرتِ روایت پر تعمیر کیا۔ حدیث سازی کے متعدد کارخانے قائم ہوئے، جہاں دین کے مصنوعی سانچے میں حدیثیں گھڑی جاتی رہیں۔ منکرینِ حدیث اپنے اس دعوی کی تائید میں اکثر یہ روایت بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ

«لَا تَكْتُبُوا عَنِّي، وَمَنْ كَتَبَ عَنِّي غَيْرَ الْقُرْآنِ فَلْيَمْحُهُ»[۵۹].

”میری نسبت سے کچھ نہ لکھو، جس کسی نے میری نسبت سے قرآن کے سوا کچھ لکھا ہو، اسے مٹا دے“۔

محدثینِ کرام کی تالیفات ”کتاب الموضوعات“ اور ”کتاب الضعفاء“ سے کچھ اقتباس نقل کرتے ہیں، عوام کو کیا خبر کہ اس طریقِ کار میں کیا کیا مکر و فریب پنہاں ہیں۔۔!

۵۸۔ یعنی: بوجھ، بھاری وزن۔

۵۹۔ ملاحظہ ہو: ’صحیح مسلم‘، ج۴، ص۲۲۹۸، رقم: ۳۰۰۴، و’مسند احمد‘، ج۱۴، ص۱۴۹، رقم: ۱۱۰۸۵۔

جبکہ خود منکرینِ حدیث روایتوں کے مَا لَهُ وَمَا عَلَيْهِ سے خود بھی بخوبی آشنا نہیں۔

غلط فہمی کا ازالہ

اوراقِ گذشتہ میں ہم نہایت تفصیل سے مدلل بیان کر چکے ہیں کہ متکلم کے کلام کو سمجھنے کے لیے ایک لازمی شرط یہ بھی ہے کہ مخاطب ان خاص حالات سے آگاہ ہو، جن میں یہ کلام ظاہر ہوا۔ ورنہ صرف کلام اپنے نفی واثبات کے اعتبار سے صحیح فائدہ نہیں دے سکتا۔ بعض حکم خاص حالات ووقت کی بنا پر دیے جاتے ہیں، جو تبدیلِ ماحول کے ساتھ بدل جایا کرتے ہیں۔ مثلاً ابتدائے اسلام میں بعض مسلمان کافر سرمایہ داروں کے قبضے میں پڑ کر طرح طرح کی اذیتیں اٹھاتے رہے۔ بعض کو بے گناہ محض خدا پرستی کے جرم میں قتل کر دیا گیا۔ حضور اکرم ﷺ اور ان کے مخلص اصحاب یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے، مگر ضبطِ غم کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ لیکن مدنی دور میں جب حالات بالکل مختلف تھے، تو حضور نے اپنے نامہ بر[٦٠] کا انتقام لینے کے لیے منظم کافر حکومت کے خلاف لشکر کشی کا حکم دے دیا[٦١]۔ کون عقلمند کہہ سکتا ہے کہ حضرت سُمیہ اور یاسر رضی اللہ عنہما کی شہادت پر خاموشی اصل اسلام ہے اور قاصدِ رسول علیہ السلام کا انتقام خلافِ اسلام تھا۔۔۔!

---

٦٠ یعنی: قاصد۔

٦١ یہ 'سریۂ موتہ' یا 'غزوۂ موتہ' کی طرف اشارہ ہے۔ سن ٨ ہجری میں نبی کریم ﷺ نے حضرت حارث بن عمیر ازدی رضی اللہ عنہ کو قیصرِ روم ہرقل کے نام ایک خط دے کر روانہ فرمایا، جس میں اُسے دعوتِ اسلام دی گئی۔ راستے میں قیصرِ روم کے امیر شرحبیل بن عمرو غسانی نے قاصد کو روک کر پوچھا: کیا تم محمد (ﷺ) کے قاصد ہو؟ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہاں، تو اُس نے آپ رضی اللہ عنہ کو بے دردی سے شہید کر دیا۔ نبی
=

شروع میں مسلمان چھپ کر نمازیں ادا کیا کرتے تھے۔ مگر اس وجہ سے کہ مسجدِ حرام میں ادائے نماز کی استطاعت نہ تھی، اس لیے تا روزِ قیامت اسی طرح پوشیدہ اور حرم پاک سے باہر نماز ادا کرنی چاہیے وغیرہ وغیرہ، حالانکہ حقیقت یہی ہے کہ اصل حکم اس کے خلاف ہے، استتار واختفا بعض ناساز گار ماحول کا نتیجہ تھا۔

اصل یہ ہے کہ امر و نہی کے جو احکام تقاضائے وقت وحال سے تعلق رکھتے ہیں، وہ ہمیشہ بدلتے ہوئے ماحول میں بدل جایا کرتے ہیں۔ اسی لیے متکلم کے کلام کو سمجھنے کے لیے وقت وحالت کی واقفیت بہت اہم ہے۔

کتابتِ حدیث کی ممانعت

یہ تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ آج بھی دُنیا کے اکثر ممالک میں پڑھے لکھے لوگوں کا اوسط فی صدی بہت کم ہے اور آج سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پیشتر اہلِ علم کی تعداد آبادی کے تناسب سے یقیناً بہت ہی مایوس کن ہوگی۔ یہ اُن ملکوں کا حال تھا، جہاں منظّم حکومتیں تھیں، مدنیت تھی، تنظیم تھی، ترقی تھی، مذہب تھا، مذہب سے منسوب کتابیں تھیں، ان کتابوں کو پڑھنے پڑھانے والے گروہ تھے، خاندان تھے، نسلیں تھیں۔ اس کے برخلاف ملّتِ عربیہ پر نگاہ ڈالیے، جو وطن کے لحاظ سے، رسم ورواج کے لحاظ سے، مذہب ومذہبی

=

کریم ﷺ کو اس خبر سے صدمہ پہنچا، آپ ﷺ نے مہم جوئی کے لیے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی امارت میں تین ہزار افراد پر مشتمل ایک لشکر روانہ فرمایا۔ اسے 'غزوہ' کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں مسلمانوں کے کثیر لشکر نے شرکت کی تھی، اگرچہ نبی کریم ﷺ نے اس میں بنفسِ نفیس شرکت نہیں فرمائی۔ (تفصیل کے ملاحظہ ہو: 'المواہب اللدنیۃ'، ج۱، ص۳۶۰ و'سیرتِ سید الانبیاء'، ص۲۰۶۔۲۰۷۔)

کتاب کے لحاظ سے، اُمّی محض تھی، نہ ان میں پڑھنے لکھنے کا رواج تھا نہ کوئی باقاعدہ مذہب تھا، نہ کوئی مذہبی کتاب تھی، جس کی بنا پر تعلیم و تعلم کا رواج ہوتا، محض گنتی کے چند آدمی تھے، جو تجارتی اغراض سے اِدھر اُدھر آس پاس کے ملکوں میں آتے جاتے تھے، یہ بقدرِ ضرورت کچھ لکھنا پڑھنا جان گئے تھے۔ ورنہ ان کے تمام کاروبار محض حافظہ اور یادداشت پر منحصر تھے۔ ملک اور خاندان کے چھوٹے بڑے واقعات، اپنا شجرۂ خاندان، گھوڑے، اُونٹ اور کتوں کے نسب نامے زبانی یاد رکھتے تھے۔ عربوں کی اس مثالی یادداشت پر کوئی استعجاب کی ضرورت نہیں ہے، واقعات شاہد ہیں کہ جب کسی شخص کا کوئی حاسہ معطل ہو جاتا ہے، تو دماغ اس خاص حاسے کے فرائض بھی کسی دوسرے حاسے کے سپرد کر دیتا ہے۔ ایک نابینا حاسۂ بصر سے محروم ہو کر قوتِ لامسہ میں دونوں میں ممتاز ہو جاتا ہے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ انسان کی اندرونی صلاحیتیں خارجی امداد کے وقت دب جاتی ہیں اور اگر خارجی وسائل کا سہارا نہ ہو، تو فطرتِ انسانی اپنی قوتوں کو دوچند کر کے زیادہ کار آمد و مؤثر بناتی ہے۔ آج بھی جن دور اُفتادہ غیر متمدن قوموں میں قراءت و کتابت کا رواج نہیں ہے، دیکھا گیا ہے کہ ان کے حافظے لکھے پڑھے انسانوں کے مقابلے میں اوسطاً زیادہ تیز اور قوی ہوتے ہیں۔ یہی حال عربوں کا تھا، وہ تعلیم و تعلم سے محروم تھے۔ ہر نسل نے قوتِ حافظہ کی پرورش اور پرداخت کی اور ہر سلف نے اپنے خلف کو یہ قیمتی ورثہ عطا کیا۔ یہاں تک کہ عرب حافظے کے اعتبار سے دنیا میں ممتاز ہو گئے۔ اس جوہرِ ذاتی پر طبع موزوں و سخن سنجی نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ عرب کی فصاحت اور شعر گوئی پر غیر عربوں کو حیرت ہے کہ اس سرزمین کا بچّہ بچہ شاعر تھا۔ عورتیں فصاحت و بلاغت کے میدان میں مردوں کے قدم بہ قدم تھیں، اس حیرت و تعجب کی وجہ صرف عربوں کی تاریخ اور ان کے موروثی مزاج سے ناواقفیت

ہے۔ بات یہ ہے کہ عرب قوتِ حافظہ میں فطرت کے تنہا اِجارہ دار تھے۔ ان کی زبان اپنی وسعت اور ترنم ریزی میں ممتاز تھی۔ وطن، خاندان، افراد اور قوم سے متعلق کوئی ادنیٰ واقعہ بھی ہو فوراً شعر کا موزوں لباس زیبِ تن کرلیتا تھا۔ نثر کے مقابلے میں علی العموم سجع ومنظوم کلام حافظہ میں زیادہ دیرپا ہوتا ہے۔ اس لیے جب کبھی کوئی واقعہ کلامِ منظوم کی شکل اختیار کرلیتا اور عربوں کی قوتِ حافظہ اس کو قبول کرلیتی، تو پھر یہ پتھر کی لکیریں تھی جو مدتوں مٹائے نہیں مٹتیں۔ چنانچہ مرد وزن کے خزائنِ ذہن اشعارِ موزوں سے ہمیشہ معمور رہتے۔ ہر بچّہ والدین کی گود میں پہنچ کر یہ دو چیزیں ذاتی ورثہ کے طور پر بلا ارادہ حاصل کرتا، ایک تو ذخیرۂ کلام موزوں اور دوسرے قوتِ حافظہ اور ان دونوں میراث کے سائے میں پروان چڑھنا، جوان ہونا، اس لیے فطری طور پر جاہلیت میں ہر عرب بچّے کا ذہن فصاحت وبلاغت کے سانچہ میں ڈھلتا تھا، حافظے میں اشعار کے خزانے محفوظ تھے، لہذا ان میں ہر ایک بڑا ہو کر شاعر بذلہ سنج نظر آتا۔ آج بھی عرب نسلیں جزیرۃ العرب میں موجود ہیں، لیکن نہ وہ جاہلیت والی شاعری ہے اور نہ وہ امتیازی قوتِ حافظہ ہے، کیونکہ ماحول بدل گئے اور یادداشت کی ضرورتیں دیگر ذرائع سے پوری ہونے لگیں۔ اس لیے فطرت نے بھی اپنے مقررہ اصول کے مطابق ان کی رفاقت کا طریقہ بدل دیا۔

اہلِ عرب کے اس تاریخی پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے اب ذرا عہدِ نزول قرآن پر نگاہ ڈالیے۔ ان میں لکھے پڑھوں کی تعداد صفر کے قریب تھی۔ جو چند افراد تحریر وکتابت سے آشنا بھی تھے، ان میں زیادہ تر کفار تھے۔ یہاں تک کہ اسلامی تاریخ وروایت صاف بتارہی ہے کہ کافر اسیرانِ بدر میں جو لکھے پڑھے چند قیدی تھے، ان کی رہائی کی شرط حضور اکرم ﷺ نے یہ قرار دی کہ ہر تعلیم یافتہ قیدی چند انصاری مسلمانوں کو کتابت کی

تعلیم دے۔ یہ ہجرت کے دوسرے سال کا واقعہ ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ بدر کے قیدی وہ منتخب سر دارانِ قریش تھے کہ جن کے قتل کے بعد بہ ظاہر جزیرۃ العرب میں اسلام کی تبلیغ بے روک ٹوک ہو سکتی تھی۔

مگر حضور اکرم ﷺ خدا کا آخری پیغام لائے تھے اور اس پیغام کے مخاطب صرف عرب ہی نہ تھے کہ ان کے حافظے پر اعتماد کیا جاتا، بلکہ اس آفتابِ ہدایت کو مطلعِ حجاز سے اُبھر کر ساری کائنات پر ضیا پاشیاں کرنا تھیں، اس لیے جزیرۂ عرب کو زیرِ اقتدار لانے سے پہلے ضروری تھا کہ کلام اللہ کو مضبوط تحریر میں لا کر جعل و تحریف سے محفوظ کر دیا جائے۔ واقفِ اَسرارِ الٰہی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو معلوم تھا کہ جزیرۃ العرب ایک دن عَلَمِ اسلامی کے نیچے آجائے گا۔ لیکن ملّتِ اسلامیہ کے پھیلاؤ سے پہلے قرآن مجید کے تحفظ کا انتظام زیادہ اہم ہے، چنانچہ آپ نے اسلامی فتوحات کی طرف سے ہاتھ روک کر کتابتِ قرآن کو مقدم قرار دیا کہ «لَا تَكْتُبُوا عَنِّي وَمَنْ كَتَبَ عَنِّي غَيْرَ الْقُرْآنِ فَلْيَمْحُهُ، وَحَدِّثُوا عَنِّي وَلَا حَرَجَ، وَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ»[٦٢]۔

"میری کوئی بات نہ لکھو، جس کسی نے میری نسبت سے قرآن کے سوا کچھ لکھا ہو، اس کو فوراً مٹا دے۔ تم لوگ میری باتیں زبانی دوسرے سے بیان کرو، اس لیے کہ اس میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ جس کسی نے میری نسبت سے جھوٹ بات کہی، اس کو اپنی قرار گاہ جہنم میں بنا لینی چاہیے"۔

---

٦٢ ملاحظہ ہو: "صحیح مسلم"، ج۴، ص۲۲۹۸، رقم: ۳۰۰۴۔

یہ ہے اصل روایت جس کے ابتدائی حصّے کو منکرینِ حدیث اپنی تائید میں لاتے ہیں۔ اگر مخالفتِ رسول صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کی پاداش میں عقل ماؤف اور بصیرت سلب نہ ہو گئی ہوتی، تو اسی حدیث میں ان کو وہ سب نعمت و دولت مل جاتی، جو ایک مؤمن معرفتِ رسول علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی وجہ سے حاصل کرتا ہے۔

کتابتِ حدیث کی ممانعت کے اسباب

یہ تو ایک مسلمہ واقعہ ہے جیسا کہ پہلے مذکور ہوا کہ عرب عموماً اُمّی تھے اور صحابۂ کرام میں آشنائے کتابت حضرات کا شمار اور بھی کم تھا، اس لیے آنحضرت نے کتابتِ حدیث کی ذمہ داریوں سے ان کو سبک دوش کر کے ساری توجہ کتابتِ قرآن مجید کی طرف پھیر دی۔ اس طرح حفظِ کلام اللہ کا کام پورے وثوق اور یقین کے ساتھ بآسانی انجام پاتا رہا۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ اہلِ عرب نئے مسلمان تھے۔ ان کا مزاج قرآن مجید کے سانچے میں اچھی طرح ڈھلا نہ تھا۔ اس لیے کلامُ اللہ اور کلامُ الرسول کے باہم اختلاط و ہم آمیز ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ جب ان کی قوتِ تمیز یہ قولِ خدا اور قولِ رسول کے درمیان شناخت کرنے لگی، تو پھر اس حکم کے برقرار رہنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

تیسری وجہ یہ بھی تھی کہ کلام اللہ کے ظاہر و باطن دونوں مطلوب تھے، لفظ و معنی کے ساتھ اس کی حفاظت فرض تھی، کیونکہ یہ وحیِ متلو ہے۔ لیکن حدیثیں معانی کے اعتبار سے اہم ہیں، ان کی تلاوت فرض نہیں ہے۔ لہٰذا الفاظ میں اگر کوئی ادنیٰ تغیر ہو بھی گیا، تو چنداں حرج نہیں تھا، کیونکہ حدیثوں کی بنیاد قرآن مجید پر قائم تھی، جو اپنے لفظ و معنی کے ساتھ محفوظ تھا۔

چوتھی وجہ یہ تھی، اگر قرآن کے ساتھ حدیثوں کی کتابت جاری رہتی، تو دین کی تبلیغ اور دینیات کی تعلیم میں دشواری ہوتی۔ عہدِ رسالت علیہ الصلوٰۃ والسلام میں عرب تیزی سے اسلام میں داخل ہو رہے تھے اور ان کو علمِ دین کے تحصیل کی زیادہ حاجت تھی۔ کتابتِ قرآن وروایتِ حدیث کے دو گونہ طریقِ کار نے اس کام کو آسان بنادیا۔ لوگ قرآن مجید کی کچھ یا تمام نازل شدہ سورتیں یاد کرلیتے اور زبانی ان کے مطالب سے متعلق حدیثی مرویات سن کر مطمئن ہو جاتے۔

پانچویں وجہ یہ تھی کہ کلام اللہ الفاظ وعبارت کے اعتبار سے بہت موجز اور نچوڑ تھا۔ اس کے برخلاف حدیثیں جن کی بسط وتفصیل کا کوئی اندازہ ممکن نہیں، کیونکہ حضور کی مقدس زندگی کے ہر لمحے کا ذکر ایک حدیث ہے۔ اگر ان کی کتابت کا حکم دیا جاتا، تو صحابۂ کرام بڑی دشواریوں میں مبتلا ہو جاتے اور یہ انسان کے بس کی بات بھی نہ تھی۔ لہٰذا قرآن کی کتابت اور حدیثوں کی روایت کا حکم دے کر بہت آسانیاں پیدا کر دیں۔

چھٹی وجہ یہ تھی کہ اگر قرآن مجید کی طرح حدیثوں کی بھی کتابت ہوتی، تو تلاوت وروایت میں بھی معانی کے ساتھ الفاظ کی رعایت رکھنی پڑتی، جو دشوار بھی تھا اور اُمتِ مسلمہ بہت سی نیکیوں سے محروم بھی ہو جاتی۔ آج ہم حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حدیثیں آپس میں ایک دوسرے سے بیان کرتے ہیں اور روایتِ حدیث کے ثواب سے فیض یاب ہوتے ہیں، لیکن الفاظ کی قید کی صورت میں یہ مراعات چھن جاتیں۔

ساتویں وجہ یہ ہے کہ دنیا کو یہ بتادینا تھا کہ حدیثوں کے تغیر سے اصل دین میں کوئی فرق نہیں آسکتا۔ مگر قرآن میں ادنیٰ تحریف پوری عمارت کو ڈھادے گی اور حدیثیں گھڑنے

والے حدیثوں کا انکار کرنے والے قیامت مین کہیں اور جگہ مقیم ہوں گے اور حدیثوں کی خدمت کرنے والے حدیثوں کو پرکھنے والے کہیں اور منزل گاہ بنائیں گے۔

آٹھویں وجہ یہ ہے کہ اگر قرآن مجید کی طرح حدیثوں کی کتابت کا بھی حکم دیا جاتا، تو غیر کاتب صحابہ تبلیغِ دین کی سعادت سے اس وقت تک محروم رہتے، یہاں تک کہ فنِ کتابت سیکھ لیں۔ لیکن خدمتِ دین کو دو شعبوں میں تقسیم کر کے کاتب، وغیر کاتب تمام صحابہ بلکہ ساری اُمت کو تبلیغِ دین کی آسانیاں عطا کیں اور اس پیمبرانہ سعات سے مستفیض فرمایا۔

نویں وجہ یہ ہے کہ آپ نے تحفظِ قرآن کی طرف سے مطمئن ہو کر عربوں کے موروثی حافظے کو بھی کار آمد بنائے رکھا۔

دسویں وجہ یہ ہے کہ مشکوٰۃِ نبوت سے فیض پانے والے گروہِ صحابہ کو بھی ہدایت کا مرکز بنا دینا تھا، تاکہ آنے والی نسلیں اور تابعین ان فدائیانِ رسول کی اہمیت کو جانیں اور ان کے مقام کو پہنچانیں، دین کی تفصیلات معلوم کرنے کے لیے ان کی طرف متوجہ ہوں، تلاش وجستجو کر کے رفقائے رسول علیہ صلوٰۃ والسلام تک پہنچیں، ان نفوسِ قدسیہ کی فدائیت، جاں نثاری، اخلاص، شدت واخوت میں استقلال وپامردی کا حق ادا کریں، اگر قرآن مجید کی طرح حدیثیں بھی کتابی صورت میں جمع کر دی جاتیں، تو پھر ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایک ایک صحابی کی حال معلوم کرنے کی نوبت نہیں آتی۔ لوگ مسجدِ نبوی میں محفوظ قرآن مجید اور مجموعۂ حدیث سے مقصد پورا کر لیا کرتے۔

آج جو صحابۂ کرام کی زندگیاں، ان کے کارنامے یاد ہیں اور اسلامی تاریخ کو دنیا کے تمام مذاہب کی تاریخ پر بدرجہا برتری حاصل ہے، اس کی بنیاد یہی حدیثیں ہیں۔ اگر

زبانی روایتِ حدیث کا رواج نہ ہوتا، تو لوگ صحابۂ کرام کی جستجو نہ کرتے اور اللہ تعالیٰ کے اس مبارک عطیہ سے عملاً محروم رہتے:

"وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ"[٦٣] (جنت کے حق دار مہاجر و انصار صحابہ ہیں اور جو لوگ ان پاک ہستیوں کی سچّی پیروی کریں وہ بھی ان کے ساتھ ہوں گے)

یہ دس باتیں ایک منصف مزاج کے قلب کے لیے کافی ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے کیوں قرآن کی کتابت کا حکم دیا اور حدیثوں کی کتابت سے منع فرماتے ہوئے زبانی روایت کی طرف متوجہ کیا، عاقل و فہیم کے لیے یہ مصلحتیں بہت گراں قیمت اور بیش بہا ہیں۔

٦٣؎ التوبۃ ۹: (۱۰۰)۔

تدوینِ حدیث

[۲]

(کتابتِ حدیث کے چند ابتدائی نقوش اور زبانی روایتِ حدیث کے اسباب اور اس کی اہمیت)

فہمِ کلام کی شرائط کے ذکر میں یہ بات گزر چکی کہ معانی کا صحیح علم اسی وقت ممکن ہے، جب کہ کلام کا موقع و محل اور وقت وحالت معلوم ہو، کیونکہ بعض باتین وقت وحالت سے متعلق ہوتی ہیں۔ ماحول کے بدل جانے کے بعد ان کا پہلا اثر اور حکم باقی نہیں رہتا۔

کتابتِ حدیث کی ممانعت بھی بعض حالت کے تحت مخصوص مصالح کی وجہ سے تھی۔ جب خوفِ التباس دور ہو گیا، صحابۂ کرام قرآنِ مجید کے طرزِ بیان کو اچھی طرح پہچاننے لگے، کاتبوں کی تعداد بہت بڑھ گئی اور اب اگلی سی مشقت ودشواری باقی نہ رہی، تو پھر وہ حکم بھی بدل گیا، جو کسی خاص ماحول پر مبنی تھا۔ چنانچہ رسول علیہ السلام سے ثابت ہے کہ قرآن مجید کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال بھی لکھے جانے لگے اور وہ پہلی سے قید وبند نہ رہی۔

جب ابوشاہ نے درخواست کی کہ خطبۂ مبارکہ ان کو لکھ کر عنایت ہو، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام کو حکم دیا کہ میرا یہ خطبہ ابو شاہ کو لکھ کر دے دو[۶۴]۔ یہ

---

[۶۴] یہ روایت صحاح ستہ وغیرہ کُتبِ حدیث میں ہے، تاہم 'صحیح البخاری' کے کلمات یوں ہیں:
(....فَقَامَ أَبو شَاهٍ –رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ اليَمَنِ– فَقَالَ: اكْتُبُوا لِي يَا رَسُولَ اللهِ! فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «اكْتُبُوا لِأَبِي شَاهٍ». قُلْتُ لِلْأَوْزَاعِيِّ: مَا قَوْلُهُ: «اكْتُبُوا لِي يَا رَسُولَ اللهِ؟» قَالَ: هَذِهِ الخُطْبَةَ الَّتِي سَمِعَهَا مِنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ).

=

خطبہ یقیناً قرآن مجید سے الگ تھا۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ جو ایک مشہور صحابی ہیں، حضور اکرم علیہ السلام کے اقوال سُن کر لکھ لیا کرتے تھے [٦٥]، ان کے اُس مجموعۂ احادیث کا نام ''صادقہ'' [٦٦] تھا۔ محدثین میں یہ صحیفہ مقبول ہے۔ ائمۂ اربعہ نے اس مجموعے کی روایتوں کو دلیل بنایا ہے۔

=

یعنی: جب رسول اللہ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم خطبہ ارشاد فرما چکے، تو ابو شاہ یمنی کھڑے ہوئے اور عرض کی: یا رسول اللہ! مجھے یہ لکھوا دیجیے۔ پس رسول اللہ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا: ''اسے ابو شاہ کے لیے لکھ دو''۔ امام اوزاعی سے پوچھا گیا: ''یا رسول اللہ! مجھے یہ لکھوا دیجیے'' اس بات کا کیا معنی ہے؟ تو آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: وہ خطبہ جو ابو شاہ نے رسول اللہ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم سے سُنا تھا۔

ملاحظہ ہو: 'صحیح البخاری'، ج۳، ص۱۲۵، رقم: ۲۴۳۴، و'صحیح مسلم'، ج۲، ص۹۸۸، رقم: ۱۳۵۵۔

٦٥؎ اس کا ذکر 'مسندِ احمد بن حنبل' میں یوں ہے:

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو، قَالَ: كُنْتُ أَكْتُبُ كُلَّ شَيْءٍ أَسْمَعُهُ مِنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أُرِيدُ حِفْظَهُ، فَنَهَتْنِي قُرَيْشٌ، فَقَالُوا: إِنَّكَ تَكْتُبُ كُلَّ شَيْءٍ تَسْمَعُهُ مِنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَرَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَشَرٌ يَتَكَلَّمُ فِي الْغَضَبِ وَالرِّضَا، فَأَمْسَكْتُ عَنِ الْكِتَابِ. فَذَكَرْتُ ذَلِكَ لِرَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ فَقَالَ: «اكْتُبْ فَوَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ مَا خَرَجَ مِنِّي إِلَّا حَقٌّ».

یعنی: حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں جو بات رسول اللہ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم سے سُنتا اُسے حفظ کرنے کے ارادے سے لکھ لیا کرتا تھا۔ چند قرشی لوگوں نے کہا: تم جو بات رسول اللہ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم سے سُنتے ہو، اُسے لکھ لیتے ہو حالانکہ رسول اللہ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم تو (ظاہری صورت میں) ایک انسان ہیں، کبھی حالتِ غضب اور کبھی حالتِ رضا میں گفتگو فرماتے ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے کتابتِ حدیث کا کام روک دیا۔ جب اس بات کا ذکر رسول اللہ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم سے کیا تو آپ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا: ''لکھو، کہ بے شک اُس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، میری زبان سے حق کے سوا کچھ ادا نہیں ہوتا''۔ (ملاحظہ ہو: 'مسند احمد بن حنبل'، ج۱۱، ص۵۷۔۵۸، رقم: ۶۵۱۰)۔

خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس بھی ایک صحیفہ تھا، جس میں حدیث لکھی ہوئی تھی [۶۷]، حضرت عمرو بن حزم اور بعض دوسرے صحابہ کو آنحضرت علیہ السلام نے صدقہ، دیت،

=

۶۶؎ اس کا ذکر مختلف کُتبِ حدیث وغیرہ میں ملتا ہے، مثلاً 'سنن الدارمی'، 'مسند البزار' اور 'جامع بیان العلم وفضلہ' وغیرہ میں۔ 'مسند البزار' کے کلمات یوں ہیں:

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا، قَالَ: «الَّذِي لَا يُحَبِّبُ إِلَيَّ الْـمَوْتَ الصَّادِقَةُ»، قَالُوا: وَمَا الصَّادِقَةُ؟ قَالَ: «صَحِيفَةٌ سَمِعْتُهَا مِنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ». وَمَعْنَى هَذَا الْحَدِيثِ: أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَبَاحَ لَهُ أَنْ يَكْتُبَ عَنْهُ.

یعنی: حضرت عبد اللہ عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرمایا: ''جو چیز میرے نزدیک موت کو پسندیدہ نہیں بناتی وہ 'صادقہ' ہے، لوگوں نے پوچھا: یہ 'صادقہ' کیا ہے؟ فرمایا: یہ وہ صحیفہ ہے، جسے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُن (کر اپنے پاس لکھ کر محفوظ کیا) تھا''۔ امام بزار رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُنھیں اپنی احادیث لکھنے کی اجازت مرحمت فرمائی تھی۔

ملاحظہ ہو: 'مسند البزار'، ج۶، ص۳۷۴، رقم: ۲۳۹۲، و'سنن الدارمی'، ج۱، ص۴۳۶، رقم: ۵۱۳، و'جامع بیان العلم وفضلہ'، ج۱، ص۳۰۵، رقم: ۳۹۴۔

۶۷؎ اس کا ذکر بھی صحاح ستہ وغیرہ کُتب حدیث میں ملتا ہے اور اس کے مندرجات کا علم بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ 'صحیح البخاری' میں ہے: (عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: «مَا عِنْدَنَا شَيْءٌ إِلَّا كِتَابُ اللهِ وَهَذِهِ الصَّحِيفَةُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: الْـمَدِينَةُ حَرَمٌ...») الحديث.

یعنی: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہمارے پاس اللہ کی کتاب اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پر مشتمل یہ صحیفہ ہے، جس میں یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مدینہ حرم ہے۔۔'' الحدیث۔

ملاحظہ ہو: 'صحیح البخاری'، ج۳، ص۲۰، رقم: ۱۸۷۰، و'صحیح مسلم'، ج۲، ص۹۹۴، رقم: ۱۳۷۰، و'سنن ابی داود'، ج۲، ص۲۱۶، رقم: ۲۰۲۴، و'جامع الترمذی'، ج۴، ص۲۴، رقم: ۱۴۱۲۔

فرائض اور سُنن سے متعلق تفصیلی احکام لکھوا کر دیے تھے[68]۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک کتاب تھی، جس میں انھوں نے خود حدیثیں لکھی تھیں[69]۔

یہ چند مثالیں محض ثبوت کے لیے بیان کی گئیں، ورنہ واقعات بتاتے ہیں کہ اور بھی دوسرے صحابہ سے حدثیوں کی کتابت ثابت ہے اور اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ حضور کے فرمان کو حضور کے زمانے میں صحابہ سے زیادہ کسی نے سمجھا ہو۔۔! حقیقت تو یہ ہے کہ ہر امر و نہی کا صحیح علم صحابہ کو تھا اور دنیا کو صحابہ کی وساطت سے حاصل ہوا، اس لیے کسی کا یہ کہنا کہ حدیثیں قرنِ اوّل یعنی: عہدِ صحابہ میں نہیں لکھی گئیں اور آنحضرت کی ممانعت وقتی مصلحت پر مبنی نہ تھی، یہ سراسر غلط اور واقعات سے لاعلمی ہے۔

زبانی روایتِ حدیث

اس میں شبہہ نہیں کہ قرنِ اوّل میں کتابتِ حدیث کا عام رواج نہ تھا۔ ساری توجہ کتابتِ قرآن مجید پر مرکوز تھی۔ پھر صحابہ کی ایک جماعت سے جمع و کتابتِ حدیث ثابت ہے اور آگے چل کر تحفظِ قرآن کی طرف سے اطمینان ہو گیا، تو ہر دور میں حدیثوں کی

۶۸؎ ’جامع بیان العلم وفضلہ‘، (ج۱، ص۳۰۳، رقم۳۹۲) میں ہے: وَكَتَبَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كِتَابَ الصَّدَقَاتِ وَالدِّيَاتِ وَالْفَرَائِضِ وَالسُّنَنِ لِعَمْرِو بْنِ حَزْمٍ وَغَيْرِهِ.

یعنی: رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمرو بن حزم وغیرہ کو صدقات، دیات، فرائض اور سُنن وغیرہ کے احکام لکھوائے تھے۔

۶۹؎ ’جامع بیان العلم وفضلہ‘، (ج۱، ص۳۱۱، رقم۳۹۹) میں ہے: عَنْ مَعْنٍ قَالَ: أَخْرَجَ إِلَيَّ عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ عَبْدِ اللهِ بْنِ مَسْعُودٍ كِتَابًا وَحَلَفَ لِي: إِنَّهُ خَطُّ أَبِيهِ بِيَدِهِ.

کتابت، روایت اور جمع و ترتیب عام ہو گئی، کیونکہ حدیثوں کی اہمیت کو صحابہ اور ان کے بعد مؤمنین مخلصین اچھی طرح جانتے تھے اور قرآن مجید کے ساتھ ان کا تعلق تفسیر و تکملہ کا تھا[ے]۔ منعِ کتابت حدیث میں حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جہاں قرآن مجید کی طرف توجہ دلائی، وہاں زبانی روایتِ حدیث کا حکم دیا اور وضعِ حدیث سے ڈرایا، تاکہ قرآن کے ساتھ ساتھ حدیثیں بھی اُمت تک پہنچیں اور ضائع نہ ہوں۔ اگر صرف قرآن مجید ہدایتِ خلق کے لیے کافی ہوتا، تو ہرگز آپ ﷺ روایتِ حدیث کا حکم نہ دیتے۔

اگر کوئی شخص یہ خیال کرلے کہ قرنِ اوّل کے ابتدائی دور میں حدیثوں کی عام کتابت ممنوع تھی اور صرف زبانی روایتیں ہوتی تھیں۔ اس لیے سہو و نسیان کا اندیشہ ہے اور حدیثوں کی محفوظیت پر اطمینان نہیں کیا جاسکتا اور جو چیزیں بطور خود اطمینان بخش نہ ہوں، وہ بنائے دین نہیں بنائی جاسکتیں۔ اس لیے حدیثوں کو خلط والتباس کی وجہ سے رد کردینا چاہیے۔ یہ اور اسی قسم کے دوسرے شبہات تہاون واستخفافِ حدیث کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں، صحابہ کے مزاج اور اہلِ عرب کے موروثی حافظے سے ناواقفیت کی بنا پر ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ رفقائے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام وہ یگانہ و یکتا افراد ہیں، جو نبی اُمی ﷺ کے سوا کسی اور رسول و نبی کو نہیں ملے۔ دین کی تکمیل ہو رہی تھی اور نبوت و رسالت پر اب آخری مہر لگائی جانے والی تھی۔ اس لیے اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے خزانۂ قدرت سے حضور کے گرد ایسے نفوسِ قدسیہ کو اکٹھا کردیا، جو تبلیغ واشاعتِ دین میں بے مثال جوہر دکھائیں اور کلام اللہ کے ساتھ ہر قول و عملِ رسول علیہ السلام عامۃ الناس تک پہنچا

ے قرآن متن ہے، حدیثیں شرح ہیں، متن کی حفاظت شرح پر مقدّم ہے۔ ۱۲ منہ

دیں۔ خود ان کا حال یہ تھا کہ مشکوٰۃِ نبوت سے نکلی ہوئی ہر شعاع کو اپنے دل میں سمو لیتے تھے، اپنی پاک زندگیوں پر اُتار لیتے تھے اور دوسروں کو اسی روشنی میں منوّر ہو جانے کی ہدایت کرتے تھے۔ قرآن مجید کی جو تفسیر حضور سے حاصل کرتے، دوسروں تک قرآن اسی تفسیر کے ساتھ پہنچانے کی کوشش کرتے ۔ اس امکان کے پیش نظر کہ شاید کوئی صحابی روایتِ حدیث میں غلطی کر رہا ہو، یا بعض اجزائے حدیث اس کے حافظے سے نکل گئے ہوں، خود صحابہ بنظرِ احتیاط ان حدیثوں کے قبول کرنے میں بہت محتاط تھے اور اس وقت تک کوئی روایت قبول نہیں کرتے تھے، جب تک کہ اُس کی تائید و تصدیق دوسرے کسی صحابی سے حاصل نہ ہو جائے۔

حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام صفِ انبیاء میں آفتاب کی طرح ہیں کہ آپ کی تجلیات میں ان کی تعلیمات چھپ گئیں، لیکن صحابۂ کرام کے درمیان ماہِ روشن کے مثل ہیں۔ کبھی آپ تنہا نظر نہ آئے، بلکہ ہمیشہ آپ کے گرد جاں نثاروں کا جھرمٹ رہا۔ اس لیے آپ کی کوئی حدیث یا اس کے اجزاء کسی ایک صحابی کے حافظے سے نکل گئے، دوسروں کی یاد دہانی نے اہلِ علم کو واپس دلا دیے، اسی لیے ایسا کوئی بیان نہیں ملتا کہ ایک صحابی کی روایت کی تصدیق عند المطالبہ کسی صحابی سے نہ ہوتی ہو، اس کے علاوہ اصحابِ کرام میں ایک ایسی جماعت بھی تھی، جن کا کام اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ مسجد نبوی میں دربارِ رسالت سے وابستہ رہیں اور حضور کے چشم و ابرو کے ہر اشارے کو یاد رکھیں اور عمل پیرا ہوں۔ اس گروہ کا نام 'اصحابِ صفہ' ہے۔ اخیر دور میں جب اسلام پھیلنے لگا اور قرآن کی اشاعت عام ہو گئی، حدیثوں کی روایت و حفاظت کو کوئی خطرہ نہ رہا۔ یہی اصحابِ صفہ اپنی قیام گاہ سے نکل

کر اِدھر اُدھر پھیل گئے۔ ان کی اسی وقت تک بڑی ضرورت تھی، جب تک حدیثوں کی اشاعت نہ ہوئی تھی اور روایت میں خلط وآمیزش کے خطرات تھے۔

صحابۂ کرام محبتِ رسول ﷺ اور جذبۂ اطاعت واتباع کی وجہ سے ایک خاص مزاج کے مالک ہوگئے تھے۔ غیر حفاظِ قرآن صحابہ بھی قرآن کی آیتوں کو سُن کر سمجھ جاتے تھے کہ یہ اپنے طرز بیان اور معانی کے لحاظ سے اللہ کا کلام ہے۔ اسی طرح جب یہ کوئی حدیث سنتے تو فوراً اس کا اندازہ کرلیا کرتے کہ یہ قولِ رسول علیہ السلام ہے۔ کیونکہ دینی استغراق نے ان کے اندر ایک ایسا ملکہ پیدا کر دیا تھا، جس سے وہ حضور اکرم کے مزاج داں بن گئے تھے، روحِ اسلام کو اچھی طرح جانتے تھے اور قولِ رسول کو پہچان لیتے تھے اور یہ کوئی ناممکن سی بات نہیں ہے، آج بھی کوئی اسکالر کسی خاص شاعر کا گہرا مطالعہ کرتا ہے، تو پھر اس کے اندر یہ ملکہ پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے شاعر کے کلام کو دوسروں کے اشعار سے تمیز کرلے۔

یہ تو یقینی ہے کہ وضعِ حدیث کا کام کسی صحابی کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ ان کی پاکیزگی وقدوسیت، عظمت ورفعت کا ذکر بار بار قرآن میں آیا ہے۔ ان کی زندگیاں دین وپیغمبرِ دین پر نثار تھیں اور ان کے کان آشنا تھے کہ حضور ﷺ کے نام پر جھوٹی روایت بیان کرنے کی سزا جہنم ہے۔ صحابۂ کرام جو تقویٰ وخشیت میں منتخب خلق تھے اور کچھ یاد نہ رکھیں، مگر دھمکی اور وعید کی باتیں تو کبھی فراموش نہیں ہوسکتی تھیں، کیونکہ یہ انسانی نفسیات اور فطرت کے خلاف ہے۔

حدیثوں کی روایت جب کہ صحابۂ کرام کے درمیان محفوظ رہیں، تو پھر اپنی کثرتِ اشاعت کی وجہ سے عہدِ تابعین میں بھی گم نہیں ہوسکتی تھیں اور ہر طالبِ حق کے لیے ممکن

ہے کہ عصورِ مابعد میں لوگوں کی خلافِ دینی ریشہ دوانیوں کو معلوم کرلے اور انھیں مجامیعِ حدیث میں صحیح وموضوع کا انتخاب کرلے۔

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ [الاحزاب ۳۳: (۲۱)] زمانہ بدلتا رہے گا آفتاب کے طلوع وغروب سے روشنی اور تاریکی دنیا پر مسلط ہوتی رہے گی، مگر حضور کی پاک زندگی اور اس کا ہر تابناک نقش دلِ مؤمن میں کبھی مدھم نہیں ہو سکتا۔ یہی وہ اُسوہ ہے، جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے بنی نوعِ انسان کے لیے رہتی دنیا تک منارِ ہدایت بنایا ہے تاکہ لَآ اِلٰهَ اِلاَّ اللهُ کی تفسیر اَطِیْعُوا اللهَ میں ہو اور مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللهِ کی تفسیر اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ سے میسّر آئے۔

❁.....❁.....❁.....❁

باب چہارم

”حدیثوں کی کتابت اور ان کی اشاعت“

(عہدِ رسالت میں عہدِ صحابہ میں)

اسلام کا کمال اور پیغمبرِ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عظمت اسی ایک بات سے ظاہر ہے کہ دنیا میں بکثرت ہادیانِ خلق و مصلحانِ عالم آئے کہ آج اُن میں سے بعض مقدس حضرات سے منسوب گروہ کروڑوں کی تعداد میں موجود ہیں، ان کو زمین کا اقتدار حاصل ہے، فطرت کے خزانوں پر دسترس ہے۔ مگر یہ اپنے بانیانِ مذہب کی سوانح حیات سے ناآشنا اور محروم ہیں۔ سیّدنا مسیح علیہ السلام آغوشِ مادر میں اعلانِ نبوت کرتے ہیں اور تقریباً ۳۰ سال کی عمر میں دنیا والوں سے رخصت ہوتے ہیں، مگر اس تیس سالہ دورِ نبوت و تبلیغ کی نہ تفصیل معلوم ہے نہ اجمال۔ عیسائیوں کے پاس سوانح مسیحی کا حصہ غلط یا صحیح جو کچھ بھی ہے، وہ دو تین سال کے واقعات پر مشتمل ہے، نہایت ناقص ہے، نامکمل ہے، چند قصوں اور حکایتوں کے علاوہ سوانح مسیحی کے اجزاء نہیں ملتے۔ حیاتِ مسیح ایک راز ہے، ایک پہیلی ہے، ایک مسٹری (Mystry) ہے۔

سیدنا موسیٰ علیہ السلام روزِ ولادت سے عنفوان شباب تک قصرِ فرعون میں پرورش پاتے ہیں، شکوہ و شوکت کی زندگی ہے، متکبر و جابر بادشاہ کے متبنّیٰ ہیں۔ پھر یہاں سے نکل کر وہ مدین میں مقیم ہوتے ہیں۔ پیغمبرِ وقت حضرت شعیب علیہ السلام کی سرپرستی حاصل ہوتی ہے۔ ایک طویل مدت وہاں گزار کر پیمبرانہ جاہ و جلال کے ساتھ واردِ مصر ہوتے ہیں، پھر کئی لاکھ بنی

اسرائیل کو ساتھ لے کر وادیِ تیہ میں داخل ہوتے ہیں، بڑی عمر پائی، معجزات کی کمی نہیں، رفقاء بے شمار ہیں اور زندگی کا کوئی حصّہ کسی ایسے ماحول میں نہیں گزرا کہ تفصیلی حالات کا اندراج وتذکرہ غیر متوقع خیال کیا جائے۔ مگر ہزار افسوس کہ اس مقدس کلیمُ اللہ کے پورے واقعاتِ زندگی وسوانح حیات تو ہم تک کیا پہنچتے، آٹھ دس لاکھ اسرائیلیوں کو غلامی سے نجات دلانے والے پیغمبر اپنے لاکھوں لاکھ پیروؤں کے درمیان وفات پاتے ہیں، مگر کچھ مدت بعد جب کہ موجودہ توریت کی نئی ترتیب وتدوین ہوئی، کسی اسرائیلی کو موسیٰ علیہ السلام کی قبر تک کا نشان معلوم نہ تھا اور نہ آج تک دریافت ہو سکا۔ یہ ہے سلسلۂ اسرائیلی کے دو جلیل القدر رسولوں کا حال، جو صاحبِ شریعت بھی تھے اور صاحبِ معجزات بھی اور جن کی ولادت وپرورش قدرتِ خداوندی کے خاص مظاہر تھی اور آج جن دونوں کے ماننے والے علم واقتدار کے لحاظ سے ساری اقوامِ عالم مین ممتاز وسرفراز ہیں۔

دوسری طرف پیغمبرِ اسلام علیہ السلام ہیں، جو پیدا ہوئے اُمی قوم کے درمیان، گھرانہ کوئی متمول نہیں، باپ کا سایہ بھی سر سے اُٹھ چکا ہے، اسی بے سروسامانی میں اَن پڑھ لوگوں کے درمیان آپ بڑھے جوان ہوئے اور ایک دن آپ نے مرادِ ملائک مقصودِ جبریل اور محبوبِ خدا ہونے کا اعلان فرما دیا۔ آپ کے جلو میں دس لاکھ اسرائیلی ہیں نہ پڑھے لکھے رفیقوں کی جماعت، مگر آفتاب کی ضیاپاشیاں نہ تو فلسفیانہ دلائل کی محتاج ہیں اور نہ سائنسی تحقیق کی، آفتاب روشن ہے اس لیے کہ تنویر اس کی فطرت ہے، چمن کا ہر پھول، گلشن کی ہر کلی، درخت کا ہر پھل، جواہرات کے رنگ، بادلوں کی پرواز اس پر گواہ ہیں کہ نظامِ عالم میں ہر شے کی نمود ونمو تابشِ آفتاب کی رہینِ منّت ہے اور صفحۂ کائنات پر وقائع آفتابی مندرج ہیں۔ رسول عربی روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ۲۳ سالہ دورِ تبلیغ کا ہر گوشہ کتابوں میں مرقوم،

زبانوں پر جاری اور دلوں میں محفوظ رہا۔ یہاں تک کہ قبلِ بعثت کے ۴۰ سالہ دور کے اہم واقعات بھی لوگوں کی یاد سے فراموش نہ ہوئے۔ قبلِ بعثت کی زندگی بھی اتنی تابناک تھی کہ آئندہ پیمبرانہ دور کی تعمیر اس پر سیدھی کھڑی رکھی جاسکی اور بحکمِ خدا آپ نے اپنی پہلی زندگی دعوائے نبوت پر دلیل بنا کر پیش کی [اے]۔

اگلے انبیا کی سوانح اگر ہم تک نقل ہو کر نہ پہنچ سکیں تو کوئی نقصان نہیں، لیکن خاتم النبیین کی پاک زندگی کا کوئی گوشہ اگر حافظۂ خلق سے فراموش ہو جاتا، تو لاریب دین کے کمال اور نعمت کے اتمام میں فرق آجاتا اور اس کی دوبارہ یاد موت سے پہلے ناممکن تھی۔ اللہ بزرگ و برتر کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں دین عطا کیا، تو کامل اور نبی بھیجا، تو اکمل جس کی لائی ہوئی وحی بھی محفوظ ہے اور بسر کی ہوئی زندگی بھی یاد ہے۔ صلی اللہ علیہ وبارک وسلم

عہدِ صحابہ رضی اللہ عنہم اور روایت حدیث

سابقاً گزر چکا ہے کہ عہدِ رسالت کے ابتدائی ایام میں خصوصی مصالح کی وجہ سے کتابت، قرآن مجید تک محدود تھی اور حدیثوں کے لیے زبانی روایت کا حکم تھا، جو لوگ آپ کے مبارک قدموں سے وابستہ تھے، ان کو حقیقتاً روایت کی ضرورت بھی نہیں تھی، صبح و شام آپ کی خدمت میں حاضری سے ہر امر و نہی کی واقفیت براہِ راست حاصل تھی۔ پھر بھی زبانی روایتِ حدیث کا اشارہ صحیح حدیثوں کی اہمیت کی طرف تھا: حَدِّثُوا عَنِّي، (ہماری نسبت

اے یونس ۱۰: (۱۶) میں ارشاد ہوتا ہے: فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○
یعنی: ”میں قرآن کے نازل ہونے سے پہلے تمھارے درمیان عمر کا بڑا حصہ گزار چکا ہوں، تو کیا تم سمجھتے نہیں ہو!“۔ (’انوار الفرقان‘، علامہ عبد الحکیم شرف قادری رحمۃ اللہ علیہ)

سے حدیثیں بیان کرو) کا ارشاد صاف بتارہا ہے کہ ہدایتِ عالم کے لیے آپ کی حدیثوں کا منصب کیا ہے، آپ کی پاک صحبت اور مقدس رفاقت میں رہ کر جو لوگ آپ کا رنگ اختیار کررہے تھے، وہ نجومِ ہدایت ہیں جنھوں نے نورِ مبین سے کسبِ فیض کیا تھا۔ «أَصْحَابِي كَالنُّجُومِ بِأَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمُ اهْتَدَيْتُمْ»[۲۷]۔ اگر اسوۂ رسول اور احادیثِ نبوی کی روایت کا حکم نہ ہوتا، تو نئے آنے والے اور آئندہ نسلیں صبغۃ اللہ سے محروم رہتیں۔ حضور اکرم علیہ السلام کی زندگی کا گہرا رنگ صرف انھیں تک محدود رہتا، جو آپ کے آستانہ پر حاضر ہوکر فیض یاب ہوتے رہے، جو کچھ آپ نے ارشاد فرمایا، اس کے مقابل عمل پیرا ہوئے اور جو کچھ آپ نے کیا، عملاً اس کی موافقت کی، آخری دین کے پیغمبر کی حیثیت سے ایک طرف یہ حضور کا فرضِ منصبی تھا کہ اپنی روشن زندگی کی تمام شعاعیں اس آخری انسان تک بھی پہنچانے کا انتظام کریں، جو قیامت کے کنارے کھڑا ہے اور صحابۂ کرام بھی آخری رسول کے پہلے متبعین کی حیثیت سے اس کے پابند تھے کہ حیاتِ مقدسہ کا کوئی پہلو آنے والوں سے چھپا کر نہ رکھیں۔ اسی لیے ارشاد ہوا:

قَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ: «يَحْمِلُ هَذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عُدُولُهُ يَنْفُونَ عَنْهُ تَحْرِيفَ الْغَالِينَ وَانْتِحَالَ الْـمُبْطِلِينَ وَتَأْوِيلَ الْجَاهِلِينَ»[۲۸].

۲۷؎ ملاحظہ: 'جامع بیان العلم وفضلہ'، ج۲، ص۸۹۸، رقم: ۱۶۸۴۔

۲۸؎ ملاحظہ ہو: 'مسند البزار'، ج۱۶، ص۲۴۷، رقم: ۹۴۲۲۔ 'شرح مشکل الآثار'، ج۱۰، ص۱۷، رقم: ۳۸۸۴و'السنن الکبریٰ للبیہقی'، ج۱۰، ص۳۵۳، رقم: ۲۰۹۱۱۔

یعنی: اس بزرگ علم کی ذمہ داری ہر آنے والی نسل کے عادل و ثقہ لوگ اٹھائیں گے، غلو کرنے والوں کی تحریف، باطل پسندوں کی من گھڑت اور ناواقفوں کی غلط تاویل کو دور کریں گے تاکہ حضور اکرم علیہ السلام کی حدیثیں ہر دور اور ہر زمانے میں لوگوں کی رہنمائی کرتی رہیں۔

چنانچہ ابتدا میں محض زبانی روایتوں کا رواج تھا، مگر جب رکاوٹیں دور ہو گئیں، صفِ اصحاب میں لکھے پڑھے حضرات کی تعداد بڑھ گئی اور کلام اللہ اور کلام الرسول کے اندازِ بیان مین لوگ امتیاز کرنے لگے، تو زبانی روایتوں کے ساتھ ساتھ زمانۂ رسالت ہی میں کتابتِ حدیث کی بنیاد پڑ گئی اور خود آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی قرآن مجید کے علاوہ اپنے بعض خطبات اور فرامین لکھوا کر صحابہ کو دیے۔

کلامُ اللہ و کلامِ رسول میں خلط والتباس کا خوف محض پیش بنی و خطرہ کی حد تک نہ تھا، بلکہ اس کا ثبوت ملتا ہے کہ بعض صحابۂ کرام نے قرآنی آیتوں کے ساتھ اپنے مصاحف میں تفسیری حدیثوں کو بھی جگہ دے دی تھی، جس کا اثر ممکن ہے عہدِ رسالت و عصرِ صحابہ میں ناموافق نہ ہوتا۔ مگر آئندہ چل کر بڑے خطرناک عواقب اور ہولناک نتائج پیدا کر سکتا تھا، لہٰذا حضور نے موقع و محل اور حالات کی رعایت سے کتابتِ حدیث کی ممانعت فرمائی اور صحابۂ کرام پورے حزم واحتیاط سے اس پر کاربند ہوئے۔ اگرچہ عہدِ رسالت ہی میں کتابتِ حدیث شروع ہو گئی تھی، مگر اس کا عام رواج نہ ہو سکا۔ صحابہ کے اخیر دور میں جب اسلام اچھی طرح پھیل گیا اور اس کے زیرِ سرپرستی ایشیا اور افریقہ کے وسیع علاقے کے علاوہ یورپ کے کچھ حصے بھی آ گئے، تو اب اشاعتِ دین کی رفتار نئے حالات کے مطابق نئے انداز پر ہونے لگی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے یہ دستور چلا آرہا تھا کہ جب اسلام کسی نئے

علاقے میں داخل ہوتا اور کوئی نیا قبیلہ اسلام میں داخل ہوتا، تو آپ اپنے جاں نثاروں میں سے کسی قدیمُ الاسلام صحابی کو ان کی تعلیم وہدایت پر مامور فرماتے۔ خلافتِ راشدہ بھی اسی نہج پر عمل پیرا رہی۔ ہر علاقے کے والی یا ان کے نائبین صحابۂ کرام میں سے مقرر کیے جاتے۔ چنانچہ نشرِ دین کے ساتھ صحابۂ کرام بھی مملکتِ اسلامیہ کے دور ونزدیک گوشوں میں پھیل گئے اور تمام اقطارِ اسلامی میں یہ نفوسِ قدسیہ مراکزِ ہدایت بن کر دین کی تعلیم و تبلیغ میں مشغول ہوگئے، زمانہ آگے بڑھتا جارہا تھا، اسلام کی اشاعت ہورہی تھی، مگر دیدار کنندگانِ رسول علیہ السلام کی تعداد تیزی سے گھٹتی جارہی تھی۔ لوگ دور دور سے ان کی خدمت میں آتے اور اپنے پیارے رسول علیہ السلام کے دیکھنے والوں کو دیکھ کر سعادت یاب ہوتے، حضور کی زندگی کے حالات اور صحابۂ کرام کے واقعات سنتے، جن جن طرح طرح طرح کی ہدایتیں تھیں، احکام تھے اور قلب وروح کی تسکین کا سامان تھا، جو کچھ سنتے یاد کرلیتے، اور بعض حضرات ان تمام بیانات اور حدیثوں کو صحابہ سے سن کر لکھ بھی لیا کرتے، اس طرح عہدِ صحابہ ہی میں کتابتِ حدیث کارواج تابعین میں عام ہونے لگا۔ ہاں صحابۂ کرام کے درمیان یہ تعمیم نہ تھی۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کافی عمر پائی اور اپنی زندگی کا مقصد روایتِ حدیث و تعلیمِ دین کے سوا کچھ قرار نہ دیا، کیونکہ اپنے دوسرے رفقاء کے مقابلے میں روایتوں کی ذمہ داری اِن پر زیادہ تھی، یہ بزرگ صحابی اہلِ صفہ میں سے ہیں۔ جس دن سے ایمان لائے مسجدِ نبوی میں بیٹھ گئے اور آخر دم تک حضرت کے ساتھ رہے، خوراک ولباس کی بھی کبھی فکر نہ کی، عہدِ خلافت راشدہ میں بھی کوئی سیاسی ذمہ داری ان پر عائد نہ تھی، جو تعلیم وروایت میں حارج ہو اور اللہ ورسول کے یہ فرامین ان کی نگاہوں سے کبھی اوجھل بھی نہ ہوئے:

"اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡتُمُوۡنَ مَآ اَنۡزَلۡنَا مِنَ الۡبَیِّنٰتِ وَ الۡهُدٰی مِنۡۢ بَعۡدِ مَا بَیَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الۡکِتٰبِ اُولٰٓئِكَ یَلۡعَنُهُمُ اللّٰهُ وَیَلۡعَنُهُمُ اللّٰعِنُوۡنَ ○" الآیہ[74]

"اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جو لوگ ہمارے اُتارے ہوئے بینات وہدیٰ کو چھپاتے ہیں، اُن پر ہماری لعنت اور لعنت کرنے والے فرشتوں کی لعنت"۔

نیز حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا ارشاد ہے کہ «السَّاكِتُ عَنْ الْحَقِّ شَيْطَانٌ أَخْرَسُ»[75]۔

یعنی: حق بات میں خاموش رہنے والا (گونگا) شیطان ہے۔

اس دور میں روایت وکتابتِ حدیث پہلے کی نسبت زیادہ ہونے لگی اور متعدد تابعین نے حدیثین جمع کیں۔ مگر یہ ساری جمع وکتابت، اپنے انفرادی ذوقِ علم، شوقِ عمل، خدمتِ دین، استحفاظِ شریعت کے جذبے سے تھی، فدائیانِ اسلام، دلدادگانِ سنت، شیفتگان اُسوۂ نبوی بطور خود کِرَاماً بَرَرَۃ بنے ہوئے حدیثوں کی جمع وتدوین میں مشغول تھے، نہ ان کی کوئی سوسائٹی تھی، نہ کوئی ادارہ، نہ اہلِ دولت کی اس میں شرکت تھی، نہ اہلِ حکومت کا تعاون، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نظامِ عمل کچھ اس انداز پر قائم ہو گیا تھا کہ آگے آگے حکومت کی مدد سے اسلام کا علَم کسی نئی سرزمین میں داخل ہوتا، پیچھے پیچھے علمائے دین قرآن وسنت کا آفتاب وماہتاب لے کر وہاں پہنچ جاتے اور اسلامی برتری وعظمت کے دونوں پھریرے ایک ساتھ لَآ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰهِ کا نعرہ بلند کرتے۔ یعنی: فیروز

---

[74] البقرۃ۲: (۱۵۹)۔

[75] ملاحظہ ہو: 'بریقہ محمودیہ شرح طریقہ محمدیہ'، مطبعہ حلبی،۱۳۴۸ھ، ج۳، ص۱۲۷۔

مند اسلامی فوج عام سپاہیوں کے علاوہ اپنی صف میں ائمہ، علماء اور محدثین کو بھی جگہ دیتی، جس سے سیاسی فتوحات کے ساتھ دلوں کی تسخیر بھی ہو جاتی۔

صحابۂ کرام کی تعداد لاکھ کے قریب ہے، کس مسلمان کی جرأت ہو سکتی ہے کہ وہ ان نفوسِ قدسیہ کو حدیث سازی کا محور قرار دے۔ قرآن کی بے شمار آیتیں، کتبِ قدیمہ کی بشارتین رسول علیہ السلام کی حدیثیں اور تاریخی واقعات اس پر گواہ ہیں کہ نہ چشمِ دہر نے انبیاء ورسل علیہم السلام کے علاوہ ایسے افراد دیکھے، نہ فرشِ زمین کو ان کی قدم بوسی کی سعادت نصیب ہوئی، اور نہ سقفِ آسمان نے سایہ فگنی کی۔ ان صحابہ میں اکثریت اہلِ عرب کی ہے اور غیر عرب صحابہ نسل ونسب کے علاوہ اپنی زندگی کی ہر اُٹھان میں عربوں کے برابر تھے، انھوں نے جس طرح قرآن کو سمجھا اور جو کچھ رسول کو پہچانا، ہدایت کی وہی اصل اور سند ہے، کیونکہ حضور علیہ السلام نے ان کے سامنے اسلامی تعلیمات صرف نظری طور پر نہیں پیش کیں، بلکہ عملی مشق سے ہر صحابی کو قرآنِ ناطق اور سنّتِ متحرک بنادیا، ان میں ہر فرد مکمل اسلام تھا، اسلام کا پیرو تھا، اسلام کا معلم تھا، اسلام کا مفسر تھا، اسلام کا شارح تھا۔

غور فرمایئے کہ حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حدیثیں اگر ان بزرگوں سے ملیں، تو کیا وہ قرآن کی طرح حجّت نہ ہوں گی! یہ گروہ ہم تک قرآن کے راوی بھی ہیں، رسول کی سنت کے بھی راوی ہیں، اگر حدیثوں کی روایت ان سے نامعتبر ہے، تو قرآن کی روایت کیونکر صحیح اور قابلِ قبول ہو گی۔!

حضور کی حدیثیں مختلف انداز وطرز میں بھی بزرگ روایت کرتے ہیں اور دنیائے اسلام کے دور دراز کناروں میں پہنچ کر بیان کرتے ہیں، اپنی زبان سے بیان کرتے ہیں اور اپنے عمل سے اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ جو بات لاکھوں کے درمیان گردش کرے، کیا وہ

ایسی ہے کہ ہم یہ کہہ کر اس کا انکار کر دیں کہ یہ باتیں عہدِ رسالت کی کتابوں میں یا تو نہیں ملتی ہیں، یا بہت کم ملتی ہیں، صحابۂ کرام راویانِ حدیث اور عینی شاہد ہیں۔ پھر ان میں سے ہر راوی صحابی کے گرد سینکڑوں تشنگانِ علم و شیفتگانِ اسلام کا حلقہ ہے۔ کیا منکرینِ حدیث کے کہنے سے کوئی شخص اتنا بے عقل و احمق بن جائے گا کہ وہ بسر و چشم بلا دلیل و حجت یہ تسلیم کر لے کہ ہر راوی صحابی کے گرد یہ تمام تلامذہ منافق بے دین اور دشمنِ اسلام تھے، انھوں نے صحابہ کی بیان کردہ سُنتِ رسول کو صحیح صحیح بعد والوں تک نہیں پہنچایا۔۔۔!

تلامذۂ صحابہ جن کو اصطلاحِ حدیث میں 'تابعی' کہتے ہیں، عرب بھی تھے، عجمی بھی تھے۔ یہ کون صحیح الدماغ و صائب الرائے دعویٰ کر سکتا ہے کہ تمام عجمی تابعین یا عجمی ماؤں کی عرب اولاد کُل کی کُل منافق تھی، دشمنِ اسلام تھی، محرفِ سنت تھی، واضعِ حدیث تھی، جب کہ آج بھی نئے پرانے عجمی نژاد مسلمانوں میں مخلص و فدائیانِ اسلام کی کمی نہیں ہے۔ بلکہ اس وقت تو حالت یہ ہے کہ بعض لوگوں کو ان عجم نژاد بزرگوں کے ساتھ زیادہ عقیدت ہے، جو شیفتگانِ قرآن تھے۔

واقعات تو یہ بتاتے ہیں کہ اگلے عجمیوں نے اسلام میں رخنہ اندازی کی کوشش اتنی نہیں کی، جو آج دیکھنے اور سننے میں آ رہی ہے۔ اگر پچھلوں نے چند حدیثیں اپنی طرف سے گھڑ لیں تو اپنا بُرا کیا۔ اہلِ ایمان و اہلِ طاعت محدثین نے ان حدیثوں کا بھی پتہ لگایا اور ان گھڑنے والوں سے اقبالِ جرم بھی کرا لیا، مگر آج کے عجمیت پسند، خسرو پرویز سے زیادہ اسلام کے خلاف آتش افروزی میں منہمک ہیں، اگلوں نے چند حدیثیں گھڑیں اور انھوں نے ساری حدیثوں کو رد کر دیا، مگر وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ (اللہ اپنے نور کو مکمل فرمائے گا)، 'انوارِ حدیث' عام ہو کر رہے۔

حضرات تابعین رحمۃ اللہ علیہم صرف اسی پر قانع نہ تھے کہ کسی ایک صحابی کے حلقۂ درس میں شریک ہو کر جو کچھ حاصل کیا وہ کافی و وافی ہے، بلکہ ایک جگہ سے فارغ ہو کر پھر دوسرے صحابی کی خدمت میں حاضر ہوتے اور پھر ان سے تحصیلِ علم وروایتِ حدیث کرتے اور پیشتر کی حاصل کی ہوئی روایتوں کو ان کے سامنے پیش کرتے تاکہ ان کی تصدیق یا دو صحابہ کے باہم طرزِ بیان کا فرق معلوم ہو جائے۔ اسی لیے حدیث کی کتابوں میں جب آپ سندِ روایت پر نگاہ کریں گے، تو آپ پر روشن ہو جائے گا کہ راویانِ حدیث کیا کیا جانفشانیاں کرتے رہے اور ایک ہی حدیث ایک ہی راوی نے متعدد شیوخ (راوی بالا ساتذہ) سے کس طرح روایت کی ہے۔

ہر صحابی کے تلامذہ کی فہرست موجود ہے، جو حدیثوں کی تتبع کرنے والوں سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اسی طرح تابعی کے شاگردوں کا حال تھا، جنھیں اصطلاح میں 'تبع تابعین' کہتے ہیں۔ قرآن و سنت کے یہ فدائی بھی اپنے اساتذہ کی طرح ایک تابعی کی روایات لے کر دوسرے معلوم تابعی تک پہنچتے تھے اور اسی میں اپنی زندگی گزارتے تھے۔

باب پنجم

راویانِ حدیث کے حالات

(اسماءُ الرّجال کے ذریعے احادیث کا تحفّظ، دیگر طریقۂ کار اور احتیاطیں)

عرب نسب و قبیلے کے دیوانے تھے، جس طرح اپنا شجرۂ نسب اور اپنے پالتو جانوروں کے نسب ناموں کو ازبر یاد رکھتے تھے، اسی طرح دوسرے قبائلِ عرب کے نسب و انتساب سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ ہر قبیلے اور اس کی مختلف شاخوں میں اچھی خاصی تعداد ایسے انسانوں کی تھی، جن کو اپنے اور دیگر قبائلِ عرب کے نسب ناموں پر کامل عبور تھا۔ اس لیے عرب راویانِ حدیث کے حالات معلوم کرنے اور محفوظ کرنے میں اس وقت کوئی دقّت و دشواری نہ تھی۔

غیر عرب راویوں کا نشان پتہ معلوم کرنا، ان کے معاملات طرزِ بود و ماند اور تقویٰ و دین داری کی دریافت میں بڑی دشواری ہوتی، اگر قدیم عربی معاشرت اور اس کے ہمہ گیر اثرات اور پھر اسلامی تعلقات اپنے رواجی و فطری میلان کی وجہ سے اشاعتِ دین میں مددگار نہ ہوتے۔ قدیم سے یہ دستور تھا، جسے اسلام نے برقرار رکھا کہ کسی قوم و قبیلے کے موالی و غلام اسی قبیلے سے وابستہ ہوتے اور ان کا تعلق اپنے آقا قبیلے کے افرادِ خاندان کی طرح سمجھا جاتا، اسلام نے اس نظریہ کو اور قوی کر دیا۔ ظہورِ اسلام کے بعد موالاتی انتساب زیادہ استوار اور محکم مساوات و ہمدردی پر قائم ہوا۔ بلکہ وہ غیر عرب جو داخلِ اسلام ہوتے، اپنے مبلغِ دین کے ساتھ وابستہ ہو کر ان کی طرف منسوب ہو جاتے اور اس نو مسلم عجمی کی

دیکھ بھال، تعلیم و تربیت مسلمان کرنے والے اہلِ خیر افراد اور ان کے خاندان کے سپرد ہوتی، یہ تعلق اتنا مضبوط اور گہرا تھا کہ مابعد کے مؤرخین بھی بعض اوقات ان نو مسلمین کو انتسابِ قبیلہ کی وجہ سے نسباً اس خاندان سے شمار کر لیا کرتے ہیں۔

میری غرض سطورِ بالا سے صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ راویانِ حدیث کے متعلق تفصیلی معلومات فراہم کرنے میں اس وقت کوئی دشواری نہ تھی۔ ہر عرب و غیر عرب راوی اپنے انتساب کی وجہ سے بآسانی پہچانا جاتا تھا اور حاملانِ دین ان کی پوری زندگی معلوم کرنے میں سعی بھی کرتے رہتے تھے، یہی وجہ ہے کہ حدیثوں کی چھان بین نقد و تبصرہ کے ساتھ ساتھ راویوں کی زندگی اور ان کے متعلق کامل تنقیدیں موجود ہیں۔ مجہولُ الحال راویوں کے بیانات محدثین کے یہاں معتبر نہیں ہیں۔ جس طرح حدیثیں گھر گھر جا کر روایت کی گئیں، اسی طرح راویوں کے حالات بھی پوری سعی وانہماک سے مرتب کئے گئے۔ اگر کتابتِ حدیث کا رواج نہ بھی ہوتا، تو صرف زبانی روایتیں اپنی جگہ پر وہ روشن حقیقتیں ہیں، جس سے کوئی سمجھدار و ناطرفدار انکار نہیں کر سکتا۔

اسماءُ الرّجال

لیکن روایتوں کی جمع و تدوین کے بعد روایتِ حدیث کو استحکام و قوت مل گئی اور صحیح و موضوع کا انتخاب آسان ہو گیا، جو کمالِ اسلام کی بیّن دلیل ہے۔ اسماءُ الرجال پر ذخیرۂ کتب نے حدیثوں کی تصحیح و تنقید کی ایک ایسی کسوٹی مہیا کر دی ہے، جس کے بعد یہ کہنا ممکن نہیں ہے کہ صحیح روایتیں موضوعات میں مل کر بے دقعت ہو گئی ہیں۔ تدوینِ حدیث و ترتیب اسماءُ الرجال اگرچہ حدیثوں کے کامل تحفظ کے لیے اعلیٰ ذرائع انسانی ہیں، لیکن محدثین و علمائے اَعلام نے حدیثوں کو صرف روایت کی حد تک قبول نہیں کیا، بلکہ اللہ رب

العزت کو اپنے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت کو زیادہ محفوظ کرنا تھا، اس لیے اسی عصر میں مفکرین کا ایک دوسرا طبقہ بھی ساتھ ساتھ خدمتِ دین میں مشغول ہو گیا۔ یہ فقہا و مجتہدین کا گروہ تھا، جو راویانِ حدیث کے بیانات پر کھ لینے کے بعد مسائلِ فرعیہ کے استنباط میں مشغول ہوا، اس طرح نہ صرف حدیثیں اور زیادہ محفوظ ہو گئیں، بلکہ اپنے تنوعِ معانی اور مختلف اثرات کے ساتھ ہم تک پہنچیں۔

ذرا عقل کی تمام کھڑکیاں کھول کر لوگ غور کریں کہ حدیثوں کے تحفظ کے لیے جو ذرائع اختیار کئے گئے اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے خاص صلاحیتوں کے ساتھ اعلیٰ توفیق عطا کر کے ایک پاکیزہ گروہ کو پیدا کیا، کیا دنیا کے کسی اور علم وفن کی حفاظت کے لیے یا کسی اور رہنما لیڈر کے وقائع نگار بھی ایسے گزرے ہیں۔۔!

یہ بات بھی اچھی طرح ذہن نشین رہنی چاہیے کہ اگر دین میں حدیثوں کی کوئی اہمیت نہ تھی، تو پھر صحابہ سے لے کر جامعینِ حدیث تک بلکہ اس کے بعد آج تک لوگوں نے اس قدر مشقتیں کیوں برداشت کیں۔؟ اور روایتوں کے لیے کوہ پیمائی، دشت نوردی، مہاجرت اور غریب الوطنی کی کیا ضرورت تھی۔؟ اسلام کے ابتدائی ادوار میں تصحیحِ احادیث کے لیے دَر دَر کی خاک چھاننا فضول وعبث تھا، اور پھر حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمانا کہ «مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّار»[۷۶] یعنی: ''میری نسبت سے جھوٹی روایتیں بیان کرنے والوں کا ٹھکانا جہنم ہے''، غلط تھا۔ اتنی شدید دھمکی اور ہولناک وعید کسی بہت ہی اہم امر کے لیے تو درست ہے اور غیر اہم باتوں کے لیے متوازن عقل

---

۷۶ ملاحظہ ہو: 'صحیح البخاری'، ج۱، ص۳۳، رقم: ۱۱۰۔

اس کو پسند نہیں کرتی، اگر دین کی بِنا صرف قرآن مجید پر قائم رہتی، تو روایتِ حدیث کے لیے یہ احتیاط واہتمام قرین عقل نہیں ہے۔ ہاں یہ وعید اسی وقت درست و قابلِ قبول ہوتی، جب غلط حدیثوں کا اثر براہِ راست دین پر مرتب ہو رہا ہو۔ غلط و موضوع روایتیں دینِ متین و قرآن مبین پر غلط اثر ڈال سکتی ہیں، تو بلا شُبہ صحیح روایتیں دین کی توضیح اور قرآن کی تبیین کی معاون ہوں گی، محفوظ اسلام اور محفوظ قرآن کا دعویٰ اسی وقت جائز اور درست ہے، جب صحیح حدیثوں کی صحت اور محفوظیت کا یقین کیا جائے۔

جو لوگ قرآن سے حدیثوں کو علیٰحدہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ لوگ ''یُفَرِّقُوْنَ بَیْنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ''[۷۷] (اللہ اور اس کے رسول کے درمیان جدائی پیدا کرنا چاہتے ہیں) حالانکہ ہم پر اللہ کی اطاعت اور رسول کی اطاعت یعنی: دونوں کی اطاعت فرض ہے: اَطِیْعُوا اللّٰہِ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ[۷۸]۔ (اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو)۔

حج بیتُ اللہ اور روایتِ حدیث

علمائے اعلام، محدثینِ کرام، راویانِ عظام جس طرح سال کے بیشتر حصوں میں حدیثوں کی جستجو اور طلب میں چار جانب بعید فاصلے پیدل اور جانوروں پر طے کرتے اور ہر اس شخص کی خدمت میں پہنچتے، جو بلحاظِ روایت وسندِ حدیث مرکزِ نبوت سے قریب تر ہو۔ موسمِ حج کے موقع پر شمعِ نبوت وروایتِ نسبت کے یہ تمام پروانے سمٹ کر بیت اللہ کے گرد جمع ہو جاتے، کعبۂ مطہرہ نقطۂ اتصال تھا، اور ہے، جہاں اقطارِ عالم کے ہر گوشے سے اہلِ

۷۷؎ سورۃ النساء کی آیت نمبر ۱۵۰ میں ذکر کردہ کافروں کی ایک صفت کی طرف اِشارہ ہے۔ محقق

۷۸؎ النساء۴: (۵۹)۔

دیانت برابر پہنچا کرتے ہیں۔ صحابۂ کرام تابعین اور بعد کے علماء و محدثین کا یہ دستور رہا کہ زیادہ سے زیادہ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کریں اور سال بھر کی متاعِ علمی یہاں کے اہلِ علم حاضرین وزائرین کی خدمت میں پیش کریں۔

اس طریقۂ کار نے ایک طرف حدیثوں کا تصحیح و تنقید کا سامان بہم پہنچایا اور اس سے رِجال ورُواۃ کے حالات معلوم ہوتے رہے، دوسری طرف دنیائے اسلام کے کسی گوشے میں اگر کوئی دینی و دنیاوی علمی و فکری راہ پیدا ہوئی، تو اس مجمعِ عام و مرکز اہلِ اسلام کی وساطت سے تمام مملکتِ اسلامی میں پھیل گئی، علمائے بخارا ہوں، یا فقہائے اُندلس، شامی محدثین ہوں یا یمن و حضرموت کے اہلِ بنیش و دانش، سندھ و ہند کے اہلِ فکر ہوں یا روم و سسلی (صقیلہ) کے اہلِ قلم، آج سے سینکڑوں سال پہلے جب کہ کتابت و طباعت اور نشر و اشاعت کا موجودہ رواج نہ تھا، رسل ورسائل کے ذرائع مفقود تھے۔ اسلامی مصنفین کی کتابیں، مجامیعِ حدیث، اسماءُ الرجال، علمِ کلام، قرآن مجید کی تفسیریں، فقہ کی تصریحات، فلسفہ و حکمت کے کارنامے طب و سائنس کے اختراعات، ریاضی وہندسہ کی ایجادات کی خبریں، حجِ بیت اللہ کے طفیل میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل جاتی تھیں، محدثین وراویانِ حدیث، حج بیت اللہ سے فارغ ہو کر مسجدِ حرام یا مسجدِ نبوی میں کچھ دن اور قیام فرما ہوتے تھے، تاکہ علمِ سنت کے طلباء روایت و تصحیحِ روایت کا کام ان کے معیارِ علم وروایت تک مکمل کرلیں۔

علمائے اسلام کا یہ مروجہ طریقہ مغربی تسلط کے ابتدائی دور تک قائم رہا، قافلۂ حجاج میں علمائے دین اور ان کے تلامذہ زیادہ شریک ہوتے۔ زیارتِ کعبہ کے ساتھ ساتھ اپنی علمی تشنگی بُجھانے کی سعی کرتے، ان تمام علوم میں بہر حال حدیثوں کو بہت زیادہ اہمیت

تھی، کیونکہ ان کا تعلق براہِ راست قرآن مجید اور مہبط قرآن علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات مقدس صفات سے وابستہ تھا۔

مذکورہ حالات میں کسی غیر ذمہ دار یا دشمنِ رسول ﷺ کا یہ دعویٰ کہ حدیثیں معتبر نہیں اور دین کے لیے اِن کو حجت بنانا اسلام میں تحریف و تغیر ہے، کیونکہ حدیثیں نہ تو عہدِ صحابہ میں جمع ہوئیں اور نہ ان کے بعد حدیثوں کی جمع و ترتیب میں کوئی قابلِ اعتماد طریقہ اختیار کیا گیا، کتنا بے بنیاد اور حقیقت سے بعید ہے۔

آج تو یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ بعض لوگ دوسروں کے مصنفات کچھ رد و بدل کر کے اپنے نام سے مشہور کر دیتے ہیں، لیکن اسلام کے علمی عروج کے زمانہ میں مصنف اور اس کے تلامذہ اجتماعِ حج کے موقع پر لاکھوں کی موجودگی میں جس چیز کی روایت و تصحیح کر دیتے تھے، اس میں رد و بدل کی کوئی گنجایش باقی نہیں رہتی تھی۔ ساری حمد، اللہ کے لیے ہے جس نے قرآن نازل کیا، جو کتابِ مبین ہے، رسول بھیجا جو نورِ مبین ہیں، اور اس نور کی شعاعوں کو ہم تک محفوظ پہنچایا، تاکہ اس روشنی میں ہم زندگی گزرایں، جسم و روح کی اصلاح کریں، اے اللہ! اپنی خاص رحمت سے ہمیں سرفراز فرما اور خیر کی توفیق عطا فرما۔ آمین!

کعبۃ اللہ اور عرب

حجِ بیت اللہ اور روایتِ حدیث کے سلسلے میں جو چند سطریں گذشتہ اوراق میں لکھی گئی ہیں، ان کے متعلق یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ نہ تو اسلام کی ایجاد ہے اور نہ مسلمانوں کے ترقی یافتہ تمدن کا نتیجہ، بلکہ اوّل روزِ تعمیر سے آج تک اس بقعۂ مبارکہ کی مرکزیت میں کبھی فرق نہیں آیا۔ مکّہ اور اس کے ملحق علاقے عربوں کے لیے مذہبی، سیاسی، قومی اور

معاشی لحاظ سے بڑی اہمیت کے علاقے تھے، عہدِ جاہلیت کے عرب، موسمِ حج میں جزیرۃ العرب کے ہر گوشے سے یہاں آکر جمع ہوتے تھے۔

زیارتِ کعبہ، دینِ ابراہیمی کا ایک بڑا رکن تھا اور یہ اجتماع عربوں کا عظیم الشان تہوار تھا۔ سال بھر کے سیاسی جھگڑے یہاں آکر بالکل سرد ہو جاتے۔ معاشی نقطۂ نظر سے ان ایام میں مکّہ بڑی تجارتی منڈی بن جاتا تھا اور اکثر اہلِ عرب اپنی سالانہ ضروریات زندگی یہیں سے فراہم کرتے۔

فصحائے عرب اپنے ادبی شاہکار، اس عظیم اجتماع میں نقد و تبصرہ، مقابلہ و معارضہ کے لیے پیش کرتے اور جو کلام سب سے بہتر قرار دیا جاتا، پورے جزیرۂ عرب میں پھیل جاتا اور ہر وارد و صادر کی زبان پر جاری ہو جاتا، اسی طرح قبائلی عظمت کی داستانیں خاندانی روایات اور مآثرِ قومی، لوگ وہاں پہنچ کر بیان کرتے اور پورے عرب میں پھیلا دیتے۔

اسلام نے کعبۃُ اللہ کی یہ افادیت قائم رکھی اور ان خرابیوں کی اصلاح کر دی، جو عربی نخوت و غرور سے پیدا ہوتی تھیں۔ اب خاندانی مباہات، قبائلی مفاخرت اور ادبی شاہکاروں کی جگہ اسلامی علوم، تفسیر قرآن اور روایتِ سنت نے لے لی، نسب ناموں اور قومی کارناموں کو چھوڑ کر خدائے واحد کے پرستار اسلامی کارنامے اور راویانِ حدیث کے حالات بیان کرنے لگے۔

المختصر دریائے رواں کی تمام پرانی کشتیاں ڈبو دی گئیں اور اب اہلِ عرب ایک نئے جہاز کے ناخدا بن گئے اور وہ جہاز اسلام تھا، کتاب اللہ اور حدیثِ نبوی تھی۔ منکرینِ حدیث اگر عرب قدیم کا جغرافیہ، اہلِ عرب کی معاشرت، رسم و رواج اور ان کی نفسیات کا مطالعہ کرتے، تو آسانی سے حدیثوں کو غیر اہم اور مشکوک کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔

باب ششم

''حجیّتِ حدیث''

(حدیثیں ہم تک کس طرح پہنچیں؟، صحابۂ کرام کا دَور۔ روایتوں کا تسلسل۔ صحابہ، تابعین۔ عربی عجمی اور ان کی اولاد)

جو شخص حضور اکرم علیہ السلام کی نبوت پر ایمان رکھتا ہے اور آپ کو خدا کی طرف سے تعلیم دینے والا اور خبر دینے والا سمجھتا ہے، اس کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ آپ کی بعض باتوں کو تسلیم کرے اور بعض کی دینی اہمیت کا منکر ہو اور یہ بھی عقلاً ناقابلِ قبول ہے کہ آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے پورے دور تبلیغ میں جو کچھ کلام کیا، اس کا مکمل مجموعہ صرف قرآن مجید ہے اس کے علاوہ ۲۳ سال کی طویل مدت میں کسی نے کوئی کلمہ آپ کی زبان مبارک سے نہیں سُنا۔۔۔!

یقیناً قرآن مجید کے علاوہ بھی آپ کے اقوال ہوں گے، اور بہت ہوں گے اور ہونے چاہئیں، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ماسوائے قرآن آپ کے اقوال کیا تھے اور ان کی کوئی اہمیت تسلیم کی جائے یا نہیں؟ تو یہ جان لینا چاہیے کہ دورِ نبوت میں نبی کی ہر گفتگو بڑی اہم ہوتی ہے، اور اس کا دین سے گہرا تعلق ہوتا ہے، کیونکہ کوئی نبی اپنے زمانۂ تبلیغ میں لوگوں سے لایعنی اور فضول باتیں نہیں کرتا، وہ خدا کی طرف سے معلّم بن کر آتا ہے اور گروہِ مخاطبین کے سامنے اپنے قول و عمل کو معیارِ دین اور اساسِ ہدایت بنا کر پیش کرتا ہے۔ وہ بحالتِ خواب بھی نبی رہتا ہے اور بحالتِ بیداری بھی، تکلّم کے وقت بھی نبی ہے اور

خاموشی کے وقت بھی نبی ہے۔ نبوت اس کی ذات سے کبھی الگ نہیں ہوتی، اس کے تمام طور وطریق اور طرز وانداز پیغمبرانہ ہوتے ہیں، جن کی پیروی ہر غیر نبی پر فرض ہے۔

یہ ممکن ہے کہ نبی کی بعض ہدایات وقتی اور عصری ہوں اور انقضائے عہد کے ساتھ ان کی پیروی کا حکم بھی منسوخ ہو جائے، لیکن وہ تمام اقوال واعمال جن کا تعلق عمومِ دین سے ہوتا ہے اور کسی لحاظ سے وقتی نہیں کہلا سکتے، ان ہدایات کی اتباع اس وقت تک فرض ہے، جب تک نبی کی نبوت نافذ اور مؤثر ہے اور ہر پیرو کا فرض ہے کہ اپنے پیغمبر کی ہدایتوں کو اور ان کے تمام اقوال واعمال کی روایتوں کو اپنے سلف سے حاصل کریں اور خلف تک پہنچائیں اور یہ سلسلہ جس مقام پر پہنچ کر رُک جائے یا کوئی نیا نبی ظاہر ہو کر مزید تبلیغ سے روک دے، تو پھر یہ سمجھنا چاہیے کہ اب اس خاص نبی کا دورِ نبوت ختم ہو گیا اور دنیا کو اس تعلیم کی ضرورت نہیں رہی۔

حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام خدا کے آخری نبی ہیں، اس لیے اس کا امکان ہی نہیں ہے کہ کوئی دوسرا نبی ظاہر ہو کر تعلیماتِ مصطفوی کو ختم کر دے گا۔ لہٰذا اب دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں: اول یہ کہ انسانوں کو دین ومذہب کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے تمام ہدایاتِ محمدی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نشر واشاعت اور ان کی تبلیغ وتعلیم بند کر دینا چاہیے، دوم حضور کی مدتِ نبوت ختم ہو گئی اور اب آپ کے دیے ہوئے احکام میں تنفیذی صلاحیتیں نہیں ہیں، اسلامی تعلیمات کے سلسلہ میں یہ دونوں صورتیں بھی غلط ہیں اور کوئی مسلمان تسلیم نہیں کر سکتا۔

جب تک انسان کے اندر روح موجود ہے، وہ دین ومذہب سے بے نیاز نہیں ہو سکتا، اور حضور کی رسالت ونبوت بھی ابدی ہے، قیامت تک کے لیے مقدر ہو چکی ہے،

اس لیے آپ کی تعلیمات اور تمام اقوال وافعال کو آج بھی وہی اہمیت حاصل ہے، جو دعوائے نبوت کے پہلے روز تھی، اور ہمارا فرض ہے کہ احادیثِ مبارکہ پوری توجہ اور جرح وتعدیل کے بعد ان روایتوں کو الگ کریں، جن کی تصدیق نہیں ہوتی اور اُمّتِ مسلمہ کو حضور سرورِ کائنات ﷺ کے احوال، اعمال، اقوال سے باخبر رکھیں۔ بحمد اللہ ہمارے محدثینِ کرام جن میں اسلاف کی بڑی تعداد شامل اور دورِ حاضر کے چند علمائے کرام نہایت باریک بینی اور حسنِ خوبی سے یہ خدمت انجام دے رہے ہیں۔

کیا تمام یا اکثر مرویات غلط ہیں؟

کسی کا یہ دعویٰ کہ تمام حدیثیں موضوع ومحرّف ہیں یا ان میں جعلی وغیر معتبر مرویات کی اکثریت ہے، تو اس قسم کا وہم بھی میزانِ عقل میں بے وزن اور اصولِ روایت سے قابلِ رد ہے۔ جو شخص اسلام کی تاریخ سے ناواقف اور اگلے مسلمانوں کی نفسیات سے بیگانہ ہے، وہی ایسی بے عقلی کی باتیں کہے گا۔

نہ تو حضور اکرم علیہ السلام نے دینِ مبین کی تبلیغ معاذ اللہ سازشی انداز میں کی اور نہ اس کی تعلیم وترویج کا کام تہ خانوں میں چھپ کر انجام دیا، بلکہ ابتدائے نزولِ وحی سے لے کر آخری سانس تک خدا کے ہر حکم کو علی الاعلان زبانِ مبارک سے دہرایا اور اپنے قول وعمل سے اس کی برملا تصدیق فرماتے رہے۔ صحنِ کعبہ میں جا کر کہا، بوقبیس کی چوٹیوں سے للکارا، عربوں کے قومی اجتماعات کو خطاب کر کے کہا، صلح وآشتی سے لوگوں کو اللہ کی طرف بلایا، شمشیر وسناں سے تبلیغِ دین میں کام لیا۔ ۱۳/ سال تک مکہ کو مرکز بنا کر ہدایت کی اور دس سال تک اُفقِ مدینہ سے عالم پر ہدایت کے نور برسائے۔

اس لیے آپ کا کوئی قول، کوئی عمل نہ پوشیدہ رہ سکتا تھا اور نہ آپ نے ان کو پوشیدہ رکھا، بدر کی فتح میں بھی آپ کی پیمبرانہ آواز بلند تھی اور اُحد کے انتشار میں بھی «أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبْ»[۷۹] کی گونج سُنائی دے رہی تھی۔

صحابۂ کرام اور روایتِ حدیث

حضور کی برملا تبلیغ اور اعلانیہ احکامِ الٰہی کی تعمیل ایک امرِ واقعی ہے، ایک سچّی حقیقت ہے، دوستوں کا ایمان ہے اور دشمنوں کا اقرار ہے۔ ہاں قرآن کے بیان اور حدیثوں کی روایت میں صحابۂ کرام کی ذات تبلیغ کی دوسری منزل ہے۔ اگر ان بزرگوں نے سیرۃِ نبوی ہم تک پہنچانے میں معاذ اللہ جعل کیا، تحریف سے کام لیا ہے، یا ادائے فرض میں کوئی کمی کی ہے، تو بلاشُبہ بعد والوں کو حضور کی حدیثیں صحیح نہیں پہنچی ہوں گی۔ مگر ذرا سوچیے تو کہ اصحابِ رسول علیہ السلام سے یہ ممکن بھی ہے کہ روایتِ حدیث میں وضع و تحریف سے کام لیں گے۔! ہرگز نہیں، دین میں تحریف و جعل بہت ہی فحش گناہ ہے، بلکہ سراسر کفر ولادینی ہے، ان حضرات سے روایتِ دین و بیانِ سیرت میں غفلت و سُستی کا امکان بھی نہیں ہے۔ قرآنی شہادتوں سے قطعِ نظر، ان اساطینِ اسلام کی ظاہری زندگیاں صداقتِ اسلام کی روشن دلیلیں ہیں، ان بزرگوں نے رضائے الٰہی اور اتباعِ رسول میں اپنی جان و مال، آرام وسکون، خویش و اقارب، گھر بار لُٹا دیے اور محبوبِ کردگار کے اشاروں پر دیوانہ وار فدا ہوتے رہے، رضوان الله تعالى عليهم أجمعين.

---

[۷۹] ملاحظہ ہو: 'صحیح البخاری'، ج۴، ص۳۰، رقم: ۲۸۶۴۔

صحابۂ کرام کے مزاج سے آگاہ اور ان کی سوانح حیات سے جو لوگ باخبر ہیں، وہ کبھی اس کی جرأت نہیں کرسکتے کہ ان قدوسیوں پر آنحضرت کی سیرت پاک چھپائے رکھنے کا الزام لگائیں، یا ان کو روایتِ سیرت میں کسی غفلت و کوتاہی کا قصوروار ٹھہرائیں۔

یہ ماننا پڑے گا کہ حضرات صحابہ نے حضور علیہ السلام کے تمام اقوال وافعال بے کم وکاست اپنے بعد والوں سے بیان کر دیے اور اب یہ اَخلاف یعنی تابعین کا فرض تھا کہ ان تمام روایتوں کو بحفاظت تمام اپنے پچھلوں تک پہنچائیں۔ وھلّم جرًّا۔

روایتوں کا تسلسل

دنیا کی دوسری حکایات کی طرح حدیثوں کے قبول ورَد کے لیے اس بات کی واقفیت بہت اہمیت رکھتی ہے کہ آیا روایتِ حدیث میں تسلسل بدستور رہا یا درمیان میں اسلام پر کوئی ایسا دور بھی آیا، جس میں روایتوں کا سلسلہ بالکل ٹوٹ گیا تھا اور اگلوں کے بیانات پچھلوں تک براہِ راست نہیں پہنچے۔ مثلاً ہم تسلیم کرتے ہیں کہ صحابۂ کرام روایتِ حدیث میں بہت محتاط بھی تھے اور اس فرض کی طرف سے کبھی غافل نہیں ہوئے، لیکن عہدِ صحابہ اور زمانۂ تابعین کے درمیان کوئی ایسا دور اگر فرض کیا جائے جس میں کوئی راویِ حدیث باقی نہیں تھا، تو بلا شُبہ اس صورت میں ساری روایتیں مشتبہ اور مشکوک ہو جاتی ہیں۔ کسی کڑی کا درمیان سے نکل جانا زنجیر کو ناکارہ اور بے کار بنا دیتا ہے۔ اور اب یہ حدیثیں اثری اکتشافات سے زیادہ وقیع نہیں ہوں گی، جو زمین کی کھدائی کے بعد دستیاب ہوتی ہیں اور ہم ان کی مدد سے مجہولُ التاریخ اقوام کے حالات معلوم کرتے ہیں۔ کسی واقعے کا تذکرہ مسلسل روایت سے پچھلی نسلوں تک نہ پہنچے اور اس درمیان میں خمول وگمنامی کا پردہ پڑ جائے، تو پھر کمالِ یقین کی منزل ہمیشہ کے لیے گم ہو جاتی ہے۔ ظن اور تخمین اور قیاس

آرائیوں کے سوا صحیح حقیقت کا نشان نہیں مل سکتا۔ حدیثوں کی روایت میں یہ مفروضہ درمیانی وقفہ دو ہی طرح خیال میں آسکتا ہے، اوّل: اسلام کی گمشدگی یعنی اس درمیانی دور میں کوئی مسلمان باقی نہ تھا، جو حضور علیہ السلام کی تعلیم پر ایمان رکھتا ہو، اور آپ کی حدیثوں پر عمل کرتا ہو، دوم: بلا استثناء اُمتِ محمدیہ علیہ الصلوٰۃ والسلام دشمنانِ اسلام کی بدترین غلامی میں اس طرح جکڑ دی گئی ہو کہ وہ کتاب وسنت پر علانیہ عمل کرنے سے عاجز ہو۔

بحمد اللہ اسلام اور اس کے پیرو حضور کے مبارک عہد سے آج تک ان دونوں قسموں کی لعنتوں سے محفوظ ہیں، عیسائیت کی طرح نہ تو کبھی اسلام بالکلیہ پوشیدہ ہوا اور نہ یہودیت کی طرح مسلمانوں پر کبھی ایسی غلامی کا دور گزرا، مرکزِ اسلام یعنی حجازِ مقدس ہمیشہ سے پیروانِ اسلام محافظین سنّت کے قبضے میں آج تک منتقل ہوتا رہاہے۔ دیگر مسلم ممالک اپنی ناطاقتی کے بعد بھی آزادی وغلامی کے درمیان زندگی گزارتے رہے، ایسا کوئی دور نہیں آیا جس مین پوری اُمتِ مسلمہ تعلیم دین وتعمیلِ سنت سے کنارہ کش ہوگئی ہو، بلکہ ہر دور اور ہر عہد مین پاک نفسوں کا ایک گروہ پایا جاتا ہے، جو کتاب وسنت کی اشاعت بھی کرتا رہا اور پوری شدت واخلاص سے ان پر خود بھی عامل رہا۔ یہی وہ گروہ ہے، جو روایتِ حدیث میں عہدِ نبوت سے آج تک ہمارے لیے سند ہے اور مسلسل سند ہے۔ حکم خداوندی "طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ"[۸۰] شاہدِ عدل ہے۔

---

۸۰ التوبۃ۹: (۱۲۲)۔

صحابہ اور تابعین رضی اللہ عنہم کا عہد

حضور اکرم سے مکمل دین ایک گروہ (صحابہ) نے لیا اور دوسرے گروہ (تابعین) تک پہنچایا۔ یہی حضرات قرآن مجید کے راوی ہیں اور یہی حدیثوں کے بھی راوی ہیں۔ ان دونوں مآخذِ دین کی روایتوں میں صرف اتنا فرق و امتیاز ہے کہ قرآن مجید زبانی اور تحریری دونوں طرح سے منتقل ہوتا رہا۔ روز و شب کی نمازوں میں اور نمازوں سے باہر بھی۔ اس کی بکثرت تلاوت ہوتی رہی۔ تابعی نے صحابی سے ہر آیت بار بار سُنی، سن کر یاد کیا اور خود تا زندگی دہراتے رہے، لیکن حدیثوں کا معاملہ یہ نہ تھا، حدیثیں زیادہ تر زبانی روایت ہوتی تھیں، تحریری روایت بہت کم تھی۔

علمی طور پر حدیثوں کو کسی تابعی نے صحابی سے سُنا اور ان پر عامل ہو گیا، عملی حدیثوں کی حفاظت کا اس سے بہتر کوئی طریقہ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ قولی روایتوں کا حال عملی روایتوں سے کچھ مختلف تھا۔ راوی اپنے شیخ سے سن کر یاد کرلیتا اور پھر دوسرے راویانِ حدیث سے اس روایت کی تصدیق و تردید معلوم کرنے کی کوشش کرتا اور اطمینان کے بعد اپنے شاگردوں سے سند کے ساتھ بیان کرتا۔

مکتوب مصاحف کی روایتیں محدثین اسی وقت قبول کرتے جب کہ خود صاحبِ مصحف اپنے صحیفے سے حدیثیں بیان کرے اور ان کی یاد داشت اور حافظے کی طرف سے پیشتر اطمینان حاصل کر لیا گیا ہے۔ ورنہ 'الف' کے صحیفے سے 'ب' کی روایت محدثین کے نزدیک پسندیدہ نہیں ہے، کیونکہ اصل راوی کے متعلق ضروری شرائط کا علم اور اس صحیفے کی اصلیت کا یقین جب تک نہ ہو، محض انتساب اور تحریر پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔

اگر عہدِ نبوت سے آخری صحابی کی رحلت تک کے دور کو سامنے رکھیں اور اس مدت میں تابعین رُواۃِ حدیث کی پیدایش، بلوغ اور سنِ رُشد صحیح معلوم ہو، تو درایت وروایت اور گہری تاریخیت کے اصول پر بھی حدیثوں کے رد و قبول کا فیصلہ آسانی سے ہو جاتا ہے۔

فنِ اسماءُ الرجال کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے، لیکن صحابی و تابعی کے عہد کی باہم پیوستگی ایک ایسی کسوٹی ہے، جس پر روایتیں پرکھی جاسکتی ہیں اور اجمالی طور پر یقین کرنا پڑتا ہے کہ صحیح حدیثیں کثیر تعداد میں ہم تک ضرور پہنچتی ہیں۔

مثلاً حضرت علی رضی اللہ عنہ سب سے پہلے مسلمان ہیں یا ان چند مؤمنین میں ایک ہیں، جن سے پہلے حضور پر ایمان لانے والے کسی شخص کا تعین آج تک نہیں ہو سکا۔ اپنے ولادت کے دن سے حضور کی وفات تک حضرت علی رضی اللہ عنہ کبھی آنحضرت علیہ السلام سے جُدا نہ ہوئے اور جو کچھ حضور نے اللہ کی طرف سے دنیا میں کسی انسان کو سکھایا، علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اس پوری تعلیم میں برابر کے شریک ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ ہیں اور اپنے سارے علم واعمال میں نبیِ آخر کے راست باز شاگرد جانشین اور نمونہ ہیں۔ ان کی شہادت رمضان ۴۰ھ میں ہوئی، یعنی حضور کی وفات کے بعد پورے تیس ۳۰ سال زندہ ہے، اس لحاظ سے وہ تمام بچے جو وفات نبوی کے فوراً بعد پیدا ہوئے، اُن کو حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے فیض یاب ہونے کا موقع ۳۰ سال تک میسّر آیا۔ پندرہ سال قبل بلوغ کی مدت اگر اس میں سے نکال دی جائے، تو پچھلے پندرہ سال درس گاہِ علی رضی اللہ عنہ سے سندِ فراغ حاصل کرنے کے لیے بہت کافی ہیں۔ خلفائے راشدین کے علاوہ عشرۂ مبشرہ میں سے بقیہ ۶/ اصحاب اپنے دوسرے معاصرین سے ممتاز اور افضل ہیں۔ حضرت سعد بن وقاص بھی

ان دس جنتیوں میں سے ایک ہیں۔ ان بزرگ صحابی کی رحلت ۵۵ھ میں ہوئی۔ یعنی جو بچے وفات نبوی کے فوراً بعد پیدا ہوئے، وہ ۴۵ سال تک ان کی مقدس تربیت سے استفادہ کرسکے، اس میں سے کم سنی کے ۱۵؍ سال نکال دینے کے بعد سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ کے تلامذہ اطمینان سے پورے ۳۰ سال تک حدیثوں کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔

گذشتہ اوراق میں لکھا جاچکا ہے کہ وفاتِ نبوی کے وقت صحابۂ کرام کی تعداد ایک لاکھ سے کچھ زیادہ تھی اور سال بہ سال ان اکابرِ دین وملّت کی تعداد بڑھنی شروع ہوئی، ابوالطفیل عامر بن واثلہ رضی اللہ عنہ وہ آخری فرد ہیں، جن کی رحلت کے بعد صفحۂ گیتی پر کوئی صحابیِ رسول باقی نہیں رہا۔ یہ بزرگ اپنی تاریخِ رحلت کے لحاظ سے آخری نبی کے آخری صحابی ہیں۔ ان کی وفات ۱۱۰ھ میں ہوئی، گویا سابقین فی الاسلام صحابۂ کرام کی متعدد نسلیں ان کے سامنے پیدا ہوئیں۔ حضرت عامر بن واثلہ رضی اللہ عنہ نے قدیمُ الاسلام صحابیوں کے بیٹے پوتوں اور پڑپوتوں تک کو جوان ہوتے دیکھا۔

اگر صحابۂ کرام کی تعداد ایک لاکھ تھی، تو عامر بن واثلہ رضی اللہ عنہ کی رحلت کے وقت صرف عرب صحابہ کی اولاد کئی لاکھ کی تعداد میں ظاہر ہے کہ مملکتِ اسلامیہ میں پھیل چکی ہوگی۔ عجمی مسلمانوں اور ان کی اولاد خلافتِ فاروقی اور اس کے مابعد زمانوں میں فتوحاتِ اسلامیہ کے ساتھ ساتھ قلمرو خلافت کی بعید ترین سرحدوں تک پہنچ چکی تھی۔ یقیناً وہ تمام نو مسلمین اور ان کی اولاد سب کے سب منافق تو نہ تھے۔ ان میں ایسے دیندار بھی یقیناً بہت بڑی تعداد میں تھے اور یقیناً ہیں، جن پر صرف مسلمانوں کو نہیں بلکہ آج تک انسانیت کو بھی فخر ہے۔ لیکن جو لوگ اسلام کی تاثیر صرف عرب نژاد مسلمانوں کے لیے مختص سمجھتے ہیں اور عجمی مسلمانوں اور عجمی راویانِ حدیث پر اعتماد نہیں کرتے، ذرا صحابۂ کرام ہی کی اولاد سے

اندازہ کرلیں کہ آخری صحابی کے انتقال کے وقت ان کی کیا تعداد ہو گی، ذاتی اکتساب اور وراثت سے دینی علوم تفسیرِ قرآن اور روایاتِ حدیث کا کتنا بڑا سرمایہ ان کے پاس ہو گا۔

سچ ہے تعصب وعداوت انسان کو حق بینی وحق شناسی سے محروم کر دیتی ہے، ورنہ منکرینِ حدیث عقل وہوش کی سلامتی کے ساتھ یہ احمقانہ دعویٰ نہیں کر سکتے تھے۔

حدیثوں کی اہمیت ان کی صحت وصداقت کا مسئلہ اتنا واضح ہے، جسے ہر پڑھا، بے پڑھا عالم، عامی بہ آسانی اور اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔

حضرت عامر بن واثلہ رضی اللہ عنہ کا ذکر تو محض بسبیلِ تذکرہ آیا ہے ورنہ اشاعتِ حدیث اور خدمتِ دین کے لیے صحابۂ کرام اسلامی قلمرو میں پھیل گئے تھے اور مختلف مقامات کو مرکز بنا کر روایتِ حدیث میں مشغول تھے۔ مشہور مرکزی مقامات میں راویانِ حدیث صحابۂ رسول کی ایک جماعت رکھتے تھے، جن کی موجودگی میں یکے بعد دیگرے روایتیں بیان کرتے، تاکہ اگر کہیں کوئی غلطی یا بھول ہو تو دوسرے حاضر صحابی اس کی اصلاح فرمادیں۔

چنانچہ حضرت ابو ادریس خولانی بیان کرتے ہیں کہ جب میں جامع حمص پہنچا ہوں، تو دیکھا کہ ۳۲ صحابۂ رسول علیہ السلام ایک حلقہ بنائے تشریف فرما ہیں اور طالبانِ دین وتشنگانِ علم کے سامنے باری باری احادیثِ نبوی بیان کر رہے ہیں، جب ایک صحابی اپنی روایت ختم کرتے ہیں، تو دوسرے صحابی ان کی جگہ لے لیتے ہیں اور اپنی روایت شروع کرتے ہیں[۸۱]۔

۸۱۔ ملاحظہ ہو: 'مسند احمد بن حنبل'، ج۳۷، ص۴۴۶، رقم: ۲۲۷۸۳: عن أبي إدريس الخولاني قال: (دخلتُ مسجدَ حمص فجلستُ إلى حلقة فيها اثنان وثلاثون رجلاً من أصحاب =

حدیثوں کی صحیح روایت کے لیے جو قابلِ قبول طریقے آج ہمارے ذہنوں میں آسکتے ہیں، ہمارے اسلاف بالخصوص صحابہ وتابعین ان سے غافل نہ تھے، بلکہ اپنی بیش از بیش ذمہ داریوں کو یاد رکھتے ہوئے ہمیشہ روایتِ حدیث میں ان پر کاربند رہے۔

حرمین مکہ ومدینہ کا ذکر کیا، یہ تو مرکزِ نبوت وصحابیت ہیں، ان کے علاوہ شہروں میں اجل صحابہ کا اجتماع بہت اہمیت رکھتا ہے۔ مثلاً کوفے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ممتاز ترین صحابہ تقریباً پچاس ۵۰ تھے۔ بصرہ میں مقیم اکابر صحابہ کا شمار تقریباً چالیس ۴۰ ہے۔ مصر میں سترہ ۱۷/ اصحابِ رسول کا قیام تھا۔ شام میں پینتیس ۳۵ صحابہ کی تشریف آوری ثابت ہے، تین ۳ صحابیوں نے جزیرہ کو شرفِ ورود بخشا۔ خراسان کے علاقے میں پانچ صحابیوں کے مزارات ہیں۔

آخری صحابی اور ان کی تاریخِ رحلت

بہ لحاظ وفات کوفہ کے آخری صحابی حضرت عبد اللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ ہیں۔ جن کا سن ۸۶ھ میں انتقال ہوا، یعنی حضور اکرم علیہ السلام کے ۷۵ برس بعد اور مدینہ میں حضرت سہل بن سعد کی رحلت سن ۹۱ھ میں ہوئی، یعنی حضور کے بعد یہ بزرگ ۸۰ برس زندہ رہے اور بصرہ میں مقیم صحابیوں میں حضرت انس بن مالک ہیں، جنھوں نے وہیں سن ۹۳ھ میں وفات پائی، اور شامی صحابہ میں حضرت عبد اللہ بن بُسر ہیں، جن کا انتقال سن ۸۸ھ میں ہوا۔

=

النبيّ صلى الله عليه وسلم قال: يقول: الرجلُ منهم سمعتُ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم فيحدّثُ، ثم يقول الآخرُ: سمعتُ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم فيحدّثُ...) الحديث بطوله.

تابعین وراویانِ حدیث

سَابِقُوْا اِلَى الْخَيْرَاتِ (نیک کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو)
اسلام کا زرّیں اصول ہے کہ صحابۂ کرام کی مسابقت اور خیر کی طرف پیش قدمی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے، لیکن تابعین کے حالات پر اگر ہم نگاہ کرتے ہیں، تو ان کے اندر بھی صداقت کی روح جگ مگاتی ہوئی نظر آتی ہے، صحابیت کی فضیلت کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا تھا۔ لیکن دین کی خدمت اور اتباعِ رسول علیہ السلام کی راہ نہ پہلے بند تھی اور نہ آج بند ہے۔ رحمتِ عالم کا یہ بابِ عالی قیامت تک کُھلا ہوا ہے۔ لوگ ہمت کریں اور مدینۃُ السلام میں داخل ہوں۔

اسلام کے چشمۂ معرفت سے آج بھی زُلال اُبل رہا ہے، ہم صحابی تو نہیں بن سکتے مگر اس آبِ مزکّی میں ڈوب کر صبغۃُ الرسول سے بہرہ ور ہو سکتے ہیں۔ قرآن موجود ہے اور زندہ خدا کا زندہ کلام ہے۔ ہم آج بھی مُردہ دلوں میں اس کے معجزانہ اثرات سے زندگی اور گرمی پیدا کر سکتے ہیں۔ رسول اللہ کا کلمہ پڑھنے والا رسولِ پاک کو مُردہ نہ سمجھے۔ ان کی سنت قیامت تک زندہ رہے گی اور روشن اسوۂ رسول ہمیشہ اہلِ تقویٰ پر اپنی تجلیات برساتا رہے گا۔

تابعین کرام اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ چکے ہیں کہ رحلتِ نبوی کے ساتھ صحابیت کی فہرست میں اضافہ بھی ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا ہے، مگر دیدار کی فضیلت کے سوا اور جتنی عظمتیں رسول عربی علیہ السلام کے وسیلے سے بنی نوع انسان کو ملی ہیں اور مل سکتی ہیں ان کے دروازے بند نہیں ہوئے ہیں۔ صحابۂ کرام اوصافِ نبوی کے چشم دید گواہ تھے اور ان کی مقدس زندگیاں خواصِ نبوت کی زندہ مثالیں تھیں، تابعین نے بھی صحابۂ کرام کی سیرتوں کو اپنایا اور رسول اللہ کے اسوۂ مطہرہ کے سانچے میں ڈھل گئے، محمدِ عربی روحی فداہ علیہ الصلوٰۃ

والسلام نے اپنے اعجاز و صداقت سے نہ صرف صحابہ کی ذات میں بلکہ لاکھوں تابعین کی صورت میں کامل جلوہ گری فرمائی۔ آج سے ایک ہزار تین سو چھیاسی سال پہلے شیاطینِ انس و جن ایک محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام کے منکر تھے، مگر اللہ رب العزت نے اپنی قدرتِ کاملہ سے تھوڑے ہی دنوں میں ہزاروں ایسے پیدا کر دیے، جو دینِ حق کی سربلندی کے لیے اسی اخلاص و جوش سے مصروف عمل ہو گئے، جو اتباعِ محمدی سے پیدا ہوا۔ اسوۂ رسول اسلام کی ساخت و پرداخت کرتا ہے اور قرآن مجید دین کی روح ہے، دونوں کا اشتراک جب تک نہ ہو، مؤمنِ کامل بننا ناممکن ہے۔ جس طرح روحِ انسانی اپنے ظہور و نمود کے لیے جسمِ انسانی کی خواہاں ہے، اسی طرح حیاتِ ایمانی یعنی قرآن اپنی صوری تکمیل کے لیے اُسوۂ نبوی کا طلب گار ہے، صحابہ کی برتری اتباعِ سنت اور تاثیرِ قرآن کا نتیجہ ہے اور تابعین و تبعِ تابعین اسوۂ رسول اور اتباعِ قرآن کے مشترکہ وسیلے سے مرتبۂ بلند کو پہنچے۔

صحابۂ کرام جس کیمیا کی مدد سے زرِ خالص کا معیار بنے تھے، وہ نسخہ یعنی حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اقوال وافعال انھوں نے تابعین کو پہنچائے اور حضراتِ تابعین نے بھی صحابۂ کرام کے نقشِ قدم پر چل کر حیاتِ مصطفویٰ کو اپنے ظاہر و باطن کے لیے قبول کیا اور امثالِ صحابہ بن گئے، تبعِ تابعین کے گروہ نے تابعین سے رسول اللہ علیہ السلام کی حدیثیں لیں اور ان کی راہ چلے یہ سلسلۂ مقدسین، اُمتِ محمدیہ علیہ الصلوٰۃ والسلام میں ہمیشہ رائج رہا۔

عجمی تابعین اور ان کی اولاد

عربی نژاد تابعین اور ان کی اولاد کو یہ اہمیت بھی حاصل تھی کہ خدا کے آخری پیغمبر ان کی قوم میں پیدا ہوئے اور کلام الٰہی ان کی زبان میں نازل ہوا، مگر عجمی تابعین اور ان کی اولاد اس نسبتِ خاص سے محروم تھے۔ اس لیے انھوں نے عربوں کے ہم پلّہ بننے میں

زیادہ سے زیادہ کوشش کیں اور سَابِقُوْا اِلَى الْخَيْرَاتِ (نیک کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھو) مقصدِ حیات بنالیا۔

عجمی تابعین اپنا نسب تو بدلنے سے رہے اور اسلام میں نسب کو وہ اہمیت بھی نہ تھی، جس پر پیشتر اس عہد کی اقوام اور بالخصوص اعراب کی معاشرت و قومیت کی بنا تھی۔ اسلام نے ایمان و عمل صالح کو اساسِ کرامت بناکر صہیب و سلمان و بلال وزید کو بے شمار عربوں، قرشیوں بلکہ بعض ہاشمیوں پر بھی فوقیت و شرافت بخشی تھی۔ تابعین اور ان کی اولاد کے سامنے غیر عرب صحابہ کی عظمت و بزرگی کی مثالیں موجود تھیں کہ یہ نفوسِ قدسیہ محض دولتِ ایمان اور اتباعِ سنت کے ذریعے سے کس طرح سر تاجِ خلائق بن گئے، ان تابعین نے بھی وہی راہ اختیار کی اور یہ بھی نسبی فرق کے سوا تمام باتوں میں صحابہ کی پاکیزہ اولاد کے دوش بدوش نظر آنے لگے۔ حضور اکرم ﷺ کے ساتھ کمال وابستگی پیدا کرنے کے لیے عربی زبان، نبوی معاشرت اور کتاب و سنت کا علم پورے اخلاص و عقیدت اور جذبۂ عمل کے ساتھ حاصل کرنے میں مشغول ہوگئے، کیونکہ یہی چیزیں نبوت کی یادگار اور رسول کی میراث تھیں، ان کا جتنا زیادہ حصّہ میسّر آئے اسی قدر دنیا و آخرت میں ایک مسلمان عزت و کرامت کا مستحق ہوگا۔ ایمان و عمل کی مدد سے عجمی بھی عربی پر فوقیت لے جاسکتا ہے۔

چنانچہ عصرِ صحابہ سے لے کر اسلامی عروج کے آخری دور تک عجمی مسلمانوں کو خدمتِ دین و تحصیلِ زبان میں آپ بہت پیش پیش دیکھیں گے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جس طرح خالص عربوں کی صف میں ابو بکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ابنِ اُبَی اور ابو عامر اور بعد میں عبداللہ بن سبا نظر آتے ہیں، اسی طرح عجمی اہلِ تقویٰ کے ساتھ کچھ منافقین بھی مل گئے ہوں گے، لیکن پاکباز صحابۂ کرام کی اسلامی خدمات نے جس طرح دینِ حنیف کے تمام خد

وخال کی پوری حفاظت کی، بعد کے منافق وخود غرض عجمیوں کے مقابلے میں بھی مخلصین مابعد کی سعی سے اللہ کی قدیم سنّت جاری رہی۔ ثقہ راویوں کے درمیان واضعینِ حدیث اسی طرح پہچان لیے جاتے ہیں، جس طرح روشن چاند کے درمیان سیاہ دھبّے، نہ تو تمام عرب ایک جیسے تھے اور نہ تمام عجمی برابر تھے۔ دین ودنیا کی طلب ہر انسان کے دل میں یکساں نہیں ہوتی۔ برہمن زادہ اقبال حدیثوں کا پرستار تھا، لیکن زینب کبریٰ رضی اللہ عنہا کی بعض اولاد [۸۲] حدیثوں کی مخالفت میں زبان و قلم کا سارا زور خرچ کرنے میں لگی ہوئی ہے۔ اقبال نے مسلمانوں کو ذاتِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچنے کی ہدایت کی [۸۳]، لیکن ایک بدنصیب حدثیوں کا انکاری ہو کر رسول اللہ سے خود بھی دُور ہو رہا ہے اور دوسروں کو بھی گمراہ کر رہا ہے۔

❁.....❁.....❁.....❁

---

۸۲ یعنی: سرسید احمد خاں۔

۸۳ اس ضمن میں چند اشعار یہ ہیں:

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں، ورنہ
ز دیوبند حسین احمد! ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ "دیں" ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی، تمام بولہبی است

باب ہفتم

احادیث کی صحت، صداقت و عظمت

(طبقاتِ صحابہ اور تابعین کبار، خود صحابہ کے دَور میں)

یہ سلسلۂ کلام نہ فنِ جرح و تعدیل سے متعلق ہے اور نہ یہ رجال و رُواۃِ حدیث کا تفصیلی تذکرہ ہے، بلکہ ان مضامین کی واحد غرض یہ ہے کہ بعض لوگ جو جہلِ مرکب میں مبتلا ہو کر خود بھی گم کردہ راہ ہیں اور دوسروں کو بھی غافل پا کر راستے سے بھٹکانا چاہتے ہیں، ان کو خبر دار کر دیا جائے کہ حدیثوں کے خلاف ان کی ساری کوششیں فضول ہیں۔ اگر دھرم بھکشو[۸۴] نے قرآن کے معجزانہ کلام ہونے سے انکار کیا، تو کیا واقعی قرآن مجید کا اعجاز مشکوک ہو گیا؟ ہر گز نہیں، دنیا کو آج بھی چیلنج ہے کہ اس کا مقابلہ کرے، اب تو چودہ سو سال کی طویل مدت میں قرآن مجید کے دعاویٔ اعجاز کی اہمیت پہلے سے بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ ہر ماضی اپنے مستقبل کے سامنے قرآن کی عظمت پر ایک نئی دلیل پیش کرتا جا رہا ہے۔ اسی طرح جو لوگ حدیثوں کی اہمیت یا ان کی صحت و صداقت سے انکار کرتے ہیں، دھرم بھکشو کی طرح اپنے جہل کے معترف ہیں، بلکہ اعلان کر رہے ہیں اور نہ کوئی صاحبِ فہم و فراست جو اسلام کی تاریخ اور روایتِ حدیث کا تفصیلی علم رکھتا ہے، اس کو محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات، ان کی لائی ہوئی کتاب اور دی ہوئی سنت سراسر اعجاز نظر آئیں گے۔

۸۴؎ یعنی: سوامی دیانند سرسوتی۔

ذیل کی چند سطریں بھی اہمیت و صداقتِ حدیث کے ثبوت میں بطور اشارہ پیش کی جارہی ہیں۔

طبقاتِ صحابہ رضی اللہ عنہم

صحابۂ کرام اگرچہ اس صفت میں تو یقیناً باہم شریک ہیں کہ انھوں نے براہِ راست حضور علیہ السلام سے ایمان و عمل کی تعلیم حاصل کی اور بصیرت کے علاوہ اپنی بصارت سے بھی آپ کو دیکھا اور پہچانا، لیکن بعض حیثیتوں سے یہ پاک گروہ ایک دوسرے سے افضل اور ممتاز ہیں، چنانچہ اس لحاظ سے صحابۂ کرام مندرجہ ذیل طبقات میں منقسم ہیں اور ان میں سے ہر طبقے کے صحابہ حضور اکرم علیہ السلام کے بعد بڑی تعداد میں عرصۂ دراز تک زندہ رہے اور آپ کی حدیثیں انھوں نے روایت کیں، جن سے حضور کی زندگی اور اخلاق کے بہت سے ایسے پہلو بعد میں آنے والوں پر روشن ہوئے، جن کا اظہار اور علم آسان نہ تھا۔ مثلاً اُمہات المؤمنین نے حضور کے ازدواجی تعلقات کو بیان کرکے انسانی زندگی کے اس خاص شعبے میں ہدایتیں عطا کیں، کم سن صحابہ نے حضور کے بعد بڑے ہو کر ہمیں یہ بتایا کہ بچوں کے ساتھ آپ کا سلوک کیا تھا۔ طبقۂ اول میں وہ صحابہ ہیں، جو مکہ میں اظہارِ دعوت کے بعد جلد ایمان لائے اور آپ کے شیدائی و فدائی ہوگئے۔ طبقۂ دوم میں اصحابِ دار الندوہ ہیں، طبقۂ سوم میں مہاجرینِ حبشہ ہیں، طبقۂ چہارم میں عقبۂ اولیٰ کی بیعت والے ہیں۔ طبقۂ پنجم میں عقبۂ ثانیہ کے مبایعین ہیں، طبقۂ ششم میں وہ مہاجرین ہیں، جو حضور کے ورودِ مدینہ سے پہلے مقامِ قباء میں آکر رفیقِ ہجرت ہوئے، طبقۂ ہفتم میں اصحابِ بدر ہیں، طبقۂ ہشتم میں وہ صحابہ داخل ہیں، جو غزوۂ بدر کے بعد صلح حدیبیہ سے پہلے ہجرت کرکے آپ کی سرکار میں فروکش ہوگئے، طبقۂ نہم میں بیعتِ رضوان والے اصحاب ہیں، طبقۂ دہم میں وہ صحابہ ہیں، جو صلحِ حدیبیہ کے بعد

فتح مکّہ سے پہلے مسلمان ہوئے اور ہجرت کر کے مدینہ طیّبہ چلے آئے، طبقۂ یازدہم میں فتح مکّہ کے دن ایمان لانے والے اصحاب ہیں، طبقۂ دوازدہم میں کم سن صحابہ ہیں، جو حضور کے سامنے نابالغ تھے، یا بہت بچے تھے۔ طبقۂ سیز دہم میں اصحابِ صفہ ہیں، طبقۂ چہار دہم میں فقہائے صحابہ ہیں۔ پھر بلحاظ روایت صحابۂ کرام کے مختلف طبقات ہیں۔ یعنی بعض وہ گروہِ صحابہ ہیں، جن سے کئی ہزار حدیثیں مروی ہیں، بعضوں نے چند سو حدیثیں اور بعض دوسرے صحابہ سے صرف چند حدیثیں روایت ہوئی ہیں۔

صحابہ سے روایتِ حدیث میں کمی بیشی کی وجہ یہ نہیں ہے کہ کم روایت کرنے والے، یا حضور کی نسبت سے کوئی حدیث نہ بیان کرنے والے صحابہ کو آنحضرت کے اقوال واعمال کا علم نہ تھا، بلکہ وجہ یہ تھی کہ صحابہ کی دوسری متعدد جماعتیں حدیثوں کی تعلیم و تبلیغ میں مشغول ہو چکی تھیں اور سنتِ نبوی کا ہر گوشہ لوگوں کے سامنے واضح کیا جارہا تھا۔ تو پھر بلاضرورت انھیں حدیثوں کو اور واقعاتِ نبوت کو دُہرانا ان کے نزدیک کچھ مفید نہ تھا اور اندیشہ تھا اس طریقِ کار سے شاید صحابیت کا غرور نہ پیدا ہو، ورنہ سراسر محال تھا کہ حضور کی کوئی حدیث کسی صحابی کو معلوم ہو اور وہ دنیا سے پوشیدہ رکھ کر اپنے ساتھ گوشۂ قبر میں لے جائے۔ یہ دینی ذمہ داری کے بھی خلاف تھا اور رسمِ محبت کے بھی خلاف، اگر محبوب کا ذکر دوسروں کی زبان پر جاری ہو، تو انسان کان لگادیتا ہے اور اگر دوسرے خاموش ہوں، تو عاشق صادق فوراً ذکرِ محبوب چھیڑتا ہے۔ وہ صحابہ جن سے ایک ہزار سے زیادہ حدیثیں مروی ہیں، ان میں اُم المؤمنین عائشہ صدیقہ، ابوہریرہ، ابن عمر رضی اللہ عنہم بہت ممتاز ہیں اور جن بزرگوں سے پانچ سو حدیثیں یا اس سے زیادہ مروی ہیں، ان میں عمر فاروق، علی بن ابی طالب، عبد اللہ بن مسعود اور عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہم بہت اونچی شخصیتیں ہیں۔

غرض محدثین کرام نے ہر صحابی کی روایتوں کی تعداد اور ان کے شاگردوں کے نام اور پھر شاگردوں کے شاگردوں کے مکمل تذکرے مہیا کر دیے ہیں۔

اجلہ تابعین، کبار صحابہ کے دور میں

صحابۂ کرام کے مختصر تذکرے سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ ان بزرگوں نے اشاعتِ دین میں کوئی غفلت نہیں برتی، بالخصوص حدیثوں کی روایت کے سلسلے میں، ایک طرف انھوں نے فریضۂ تبلیغ ادا کیا، تو دوسری طرف اجتماعی روایتِ حدیث کا طریقہ اختیار کر کے سہو ونسیان سے تحفظ کا انتظام کیا۔

صحابۂ کرام دورِ نبوت کے بعد طویل مدت تک دنیا میں زندہ رہے، اخلاف کو حضور کی حدیثیں سُنا کر سیرتِ نبوی کا پیرو بناتے رہے۔ اس طویل صد سالہ دور میں جو ہزاروں ہزار تابعین پیدا ہوئے اور انھوں نے تحصیلِ حدیث و تبلیغِ دین اپنا مقصدِ حیات بنالیا، ان میں بھی مختلف طبقات ہیں، اگر تابعین کی زندگیوں کو صحابۂ کرام کے خیالات کے ساتھ ملا کر راویانِ حدیث پر غور کریں، تو کسی طرح بھی یہ شبہہ نہیں پیدا ہو گا کہ حدیثیں صحابہ نے نہیں بیان کیں یا ہم تک صحیح حدیثیں نہیں پہنچی ہیں۔

ذیل میں تابعین کے طبقات اور ہر طبقہ کے چند راویانِ حدیث کی تاریخِ وفات درج کی جاتی ہے تاکہ ناظرین کو اندازہ ہو کہ دورِ صحابہ کے بعد کے راویانِ حدیث کیسے ہیں اور ان تابعین کو دورِ صحابہ سے کتنا حصّہ ملا اور یہ کتنی مدت اصحابِ رسول کی خدمت میں گزار سکے۔

تابعین کے پہلے طبقہ میں وہ لوگ ہیں، جو عشرۂ مبشرہ کی زیارت وصحبت سے فیض یاب ہوئے۔ مثلاً سعیدؔ بن مسیب، ابو رجا عطاروی، ابو عثمانؔ مہدی، قیس بن عباد وغیرہم

جنھوں نے حضور اکرم علیہ السلام کو تو نہیں دیکھا، مگر ابو بکر یا دوسرے راشد خلفاء اور عشرۂ مبشرہ کے شرفِ زیارت سے فیض یاب ہوئے۔

دوسرے طبقہ کے مشہور تابعین یہ ہیں، اسوؔد بن یزید، علقمہؔ بن قیس، مسروق وغیرہم۔ تیسرے طبقہ کے مشاہیر تابعی عاؔمر بن شراحیل، عبیدؔ اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ، شرؔیح بن حارث وغیرہم (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین)

غرض تابعین بھی پندرہ طبقات میں منقسم ہیں۔ آخری تابعی وہ ہے، جس نے بصری صحابہ میں حضرت انس کو اور اصحابِ کوفہ میں عبد اللہ بن ابی اَوفیٰ اور مدنی صحابہ میں سائب بن یزید اور مصریوں میں عبد اللہ بن حارث اور شامیوں میں حضرت ابو اُمامہ باہلی کی زیارت کی۔ (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین)

حضور اکرم علیہ السلام علیہ السلام کے بعد صحابۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا طویل دور یعنی اسّی نوّے سال تک ان اساطین اسلام کا زندہ رہنا اور مختلف دیارِ اسلامی میں اجتماعی مرکز بناکر حدیثیں روایت کرتے رہنا، ایسی باتیں نہیں ہیں کہ ہم ان کو سُنیں اور کسی غور و فکر کے بغیر ان سے گزر جائیں۔ اگر حدیثیں کوئی دینی حجت نہ تھیں، تو پھر کئی ہزار صحابۂ رسول نے ان کی روایت و بیان کا بقدرِ طاقتِ بشری کیوں اہتمام کیا، خود بھی اپنی زندگیاں بے فائدے اور عبث کاموں میں گزاریں اور دوسری نئی مسلمان نسلوں کو ایک فضول کام کی طرف راغب کرکے، ان کی قیمتی زندگیوں کو برباد کیا۔ معاذ اللہ صحابہ کی معرفت رکھنے والے اور قرآن مجید کو حق سمجھنے والے نہ ایسا کبھی سوچ سکتے ہیں اور نہ کہہ سکتے ہیں۔

حدیثیں یقیناً دینی حجت تھیں اور آج تک ہیں۔ حضور کے بعد تقریباً ۹۰ برس تک صحابہ کے متعدد گروہ مختلف مراکز میں جمع ہو کر حضور کی طرف نسبت کرکے جو کچھ

روایتیں بیان کرتے رہے، وہ بلا شُبہ اس کثرت سے شائع و مشتہر ہو گئی تھیں کہ ان میں غلط و موضوع کی آمیزش آسان نہیں تھی، صحیح روایتوں میں مابعد والوں نے جو کچھ افتراء و جعل کے ذریعے خلط کیا ہے، تلاش و جستجو سے ان کا پتہ لگایا جا سکتا ہے اور لگا لیا گیا۔

اگر ہم اپنی بصارت سے چاند کے دھبّے کو دیکھ سکتے ہیں، تو بصیرت سے صحیح و روشن حدیثوں میں ملی ہوئی تاریک و غلط روایتوں میں بھی تمیز کر سکتے ہیں۔ اہلِ ایمان جانتے ہیں کہ بصیرت، بصارت سے زیادہ بااثر اور قوی ہے، نورِ ایمان کو نورِ چشم پر بدرجہا فوقیت ہے۔

❁.....❁.....❁.....❁

باب ہشتم

"جمع اور تدوینِ حدیث کے مختلف ادوار"

- حکومتِ اسلامی کا تعاون
- ایک شبہہ کا ازالہ
- عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ اور تدوینِ حدیث
- پہلی صدی ہجری کے چند مجامیعِ حدیث

حکومت اور تدوینِ حدیث

دنیا کے سارے مذاہب حکومت کی سرپرستی سے پھیلے، اقتدار کے سایہ میں پروان چڑھے اور تیغ و تفنگ کی مدد سے کامیاب ہوئے ہیں۔ جب تک کسی سیاسی اقتدار نے ان کے سروں پر ہاتھ نہیں رکھا، وہ مذاہب گمنامی اور تباہی میں گرفتار رہے یا ترقی کے بعد بھی کسی وقت حکومت کا سہارا جاتا رہا، تو پھر وہ سارے مذاہب بھی بلندی سے پستی میں آ گئے۔

مگر دینِ اسلام اس تاریخی کلیے سے مستثنیٰ ہے، مذاہبِ عالم کے برخلاف اسلام نے حکومتوں کی سرپرستیاں کیں، اقتدار کو سہارے دیے اور سیاست کو پروان چڑھایا۔

اسلام نہ حکومت و دولت کی گود میں پلا اور نہ اہلِ حکومت کی امداد سے اس نے ترقی کی، عرب کے باشندے اپنی قبائلی نخوت اور نسلی غرور میں چور تھے، ان کی طبیعت خراج یعنی: لا قانونیت کی خوگر تھی اور کسی کی برتری کا اقرار عربی مزاج کے سراسر خلاف تھا۔ جس ملک میں خودستائی کا دور دورہ ہو اور نسلی عظمت کا گیت گایا جائے، وہاں کوئی تنظیم نہ پیدا ہو سکتی ہے اور نہ کبھی کسی منظم حکومت کے لیے کوششیں کامیاب ہو سکتی ہیں۔ لیکن یہ اسلام کا اعجاز تھا کہ عرب جیسے ملک میں ظاہر ہو کر اس نے ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑ دیا، بچھڑے ہوؤں کو آپس میں ملا کر ایک کر دیا اور انسانیت کے منتشر اوراق کی شیرازہ بندی کی۔ اسلام کی سرپرستی میں ایک حکومت قائم ہو گئی، جس نے بہت جلد پھیل کر سرزمین عرب سے باہر دور دور اپنی سرحدیں قائم کیں۔

اسلام کی دعوت مادی وسائل سے بے نیاز تھی اور شروع شروع اس کے حلقۂ اثر میں آنے والے انسانی تاریخ میں سب سے کمزور اور مظلوم افراد تھے، لیکن حق کس طرح باطل کے مقابلے میں کامیاب ہوتا ہے، اس کی صحیح مثال صرف اسلام میں نظر آتی ہے کہ

اس بے سہارا مذہب کے بے بس پیرو، جو اپنے گھروں سے نکال دیے گئے تھے، نہایت ہی مختصر مدت میں ایک عظیم الشان سلطنت کے مالک بن گئے۔

اس لیے جو دین اپنی فطرت کے اعتبار سے حیات بخش قوتوں کا سرچشمہ اور اقتدارِ سیاسی کا مرکز ہو، وہ اپنی تعلیمات کی اشاعت کے لیے کسی حکومت کا محتاج نہیں ہو سکتا۔ اہلِ بصیرت فلاحِ دارین کے لیے ایسے دین کی مخلصانہ خدمت کرتے ہیں اور اہلِ ہوس خود کامی و دنیا طلبی کے لیے اسے استعمال کرتے ہیں۔

اسلامی تعلیمات دو اجزا سے مرکب ہیں: ایک قرآن مجید اور دوسرا جزء حدیث و سنت ہے۔ قرآن مجید کی اشاعت کب اور کس طرح ہوئی، یہ اس وقت موضوعِ بحث نہیں، لیکن حدیثوں کی اشاعت اور ان کی جمع و تدوین اس مقالے کا سرِ عنوان ہے۔

اوراق گذشتہ میں بیان ہو چکا ہے کہ حدیثیں کتابت کے ذریعہ سے کم اور زبانی روایتوں کی وساطت سے زیادہ شائع ہوتی رہیں۔ عہدِ نبوی میں کتابتِ حدیث چند صحابیوں تک محدود تھی، لیکن عہدِ صحابہ میں شاگردان اصحاب کرام نے اس کو فروغ دیا۔ تابعین میں ایک بڑی جماعت کا پتہ ملتا ہے، جو زبانی روایتوں کے ساتھ حدیثوں کی کتابت میں بھی منہمک تھے اور ابھی زمین زائرینِ رسول کی قدمبوسی سے محروم نہ ہوئی تھی کہ احادیثِ نبوی کے مختلف صحیفے مختلف راویانِ حدیث نے مرتب کر لیے۔

اس وقت تدوین حدیث کسی خاص فنی و فقہی نقطۂ نظر سے نہ تھی، بلکہ راویانِ حدیث اپنی یاد داشت کے طور پر جو کچھ سنتے، لکھ لیا کرتے۔ گویا اس دور میں روایتوں کے صحیفے کشکول کی حیثیت رکھتے تھے۔

ایک شبہہ کا ازالہ

خلافتِ راشدہ میں صحابۂ کرام مصروفِ قتال رہے، اسلامی سرحدات کے چاروں طرف فتنہ وفساد کی آگ بھڑک چکی تھی اور یہ حضرات بڑی بڑی جماعتیں بنا کر اسلامی مملکت کے دفاع وتحفظ اور کافروں کی سرکوبی میں حد درجہ مشغول تھے۔ اس دور میں اصحاب رسول علیہ السلام کے لیے ممکن نہ تھا کہ یہ بہ یک وقت شمشیر بکف اور قلم بدست ہو کر دینِ متین کی دوگونہ خدمت کر سکیں، بلکہ ان کے لیے حلقۂ درس ترتیب دے کر احادیثِ نبوی کی زبانی روایت کا بھی موقع نہ تھا۔ حالات جوں جوں قابو میں آتے گئے اور تعلیم وتدریس کی راہیں آسان ہوتی گئیں صحابۂ کرام بلا تاخیر اس فریضۂ دین کی طرف متوجہ ہو گئے۔

حدیثوں کی زبانی روایت اور تحریری بیان میں انھوں نے عام طور پر اپنے لیے پہلی صورت بہتر قرار دی، کیونکہ اس طریقِ تعلیم سے حدیثوں کی اشاعت بھی زیادہ وسیع پیمانے پر ممکن ہوئی اور جابجا علمی مدارس قائم ہو گئے۔

اس لیے کتابتِ حدیث کے سلسلے میں نہ تو صحابۂ کرام پر غفلت کا الزام ہے اور نہ حدیثوں کی اہمیت میں کوئی فرق آتا ہے، جنگ وقتال کے زمانے میں دینی تقاضے اور ہوتے ہیں، صلح وامن کے دنوں میں اور، خلافتِ راشدہ کے ابتدائی ایام میں اصل فوج اور کمک دونوں میں صحابۂ کرام کو شریک ہونا پڑتا تھا۔

عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ اور تدوینِ حدیث

یہ سعادت آلِ خطّاب کے لیے مقدر ہو چکی تھی کہ ہر آڑے وقت میں یہ کام آئیں، اور جب کبھی باطل حق میں ملنا چاہے، کوئی فرو نگاہ فاروقی لے کر ظاہر ہو اور نیش کو

نوش سے الگ کر دے۔ عہدِ رسالت میں عمرِ اول رضی اللہ عنہ کا ایمان، اسلام کی قوت بنا، دورِ صدیقی رضی اللہ عنہ میں تحفظِ قرآن کی ساری کوششیں ابن خطاب کی دور اندیشی کا نتیجہ تھیں۔ قرآن اگرچہ عہدِ رسالت میں محفوظ اور شایع ہو چکا، لیکن کتابت کے لحاظ سے اس سرکاری نسخے کے سوا جو حرمِ نبوی میں رکھا رہتا تھا، اس کی کوئی اور نقل باضابطہ اور مستند نہ تھی۔ صحابۂ کرام نے بھی بطور خود قرآن مجید کی آیات اور سورتوں کو اپنے پاس لکھ رکھا تھا، مگر وہ عموماً مصاحف کی گویا مقدس بیاض تھی، جس میں رعایتِ تنزیل، شانِ نزول، حدیثیں سب کچھ درج تھیں۔ یمامہ میں حُفاظِ قرآن کی خاصی تعداد شہید ہو گئی، جو قرآن مجید اور اس کی نبوی ترتیب کے امین تھے۔ وقت کا تقاضا اور دین کا مطالبہ ہوا کہ قرآن مجید اس طرح جمع کیا جائے، جس میں غیر قرآنی آیتوں کی آمیزش نہ ہو، تاکہ آئندہ دوسرے صحابہ کی مقدس بیاضوں کو دیکھ کر اُمتِ محمدیہ حیران نہ ہو۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس خطرہ کا اندازہ کر لیا اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اپنا ہم خیال بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ قرآن مجید چند صحابہ کی نگرانی میں ایک خاص مجموعے میں مرتب کر دیا گیا اور اب قیامت تک ہر خطرے سے محفوظ ہے۔

بالکل یہی کیفیت جمع و تدوین حدیث کی ہے۔ حدیثیں کچھ صحابۂ کرام نے بھی اپنے پاس لکھ رکھی تھیں، ان حضرات سے سُن کر تابعین نے بھی حدیثیں لکھ لیں۔ پہلی صدی ہجری کے اختتام سے پہلے صحابہ و تابعین کی لکھی ہوئی حدیثوں کے مجموعے بہت ہو گئے، مگر یہ تمام صحیفے راوی کی اپنی ملکیت تھے اور اسلامی مملکت میں بکھرے ہوئے اور منتشر تھے۔

اب تک حدیثوں کی روایت و کتابت کا کام صحابہ اور تابعین اپنے علمی ذوق اور دینی شغف کی بناء پر کرتے رہے، حکومت آئینی طور پر غیر جانبدار رہی کسی امیر یا خلیفہ کو

حدیثوں کی جمع و تدوین کی طرف توجہ نہیں ہوئی، ممکن ہے کہ اس کی خاص وجہ یہ ہو کہ ابھی صحابۂ کرام سے دنیا خالی نہیں ہوئی تھی اور روایتوں کا سارا کام ان کی نگرانی اور صحبت میں انجام پا رہا تھا۔ لوگ مختلف حلقۂ ہائے درس میں شریک ہو کر صحابۂ کرام سے روایتیں سنتے اور حضرت عمر فاروق خلیفۂ ثانی رضی اللہ عنہ کے گزشتہ فرمان: "قَيِّدُوْا الْعِلْمَ بِالْكِتَابِ"[۸۵] (ہر علم کو ضبطِ تحریر میں لے آیا کرو) کے مطابق لکھ لیا کرتے تھے۔ کیوں نہ ہو قلم کی تخلیق اور اس کا استعمال اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے اور اپنی عظمت و کبریائی پر تعلیم بالقلم[۸۶] کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن مجید میں بطور دلیل بیان فرمایا ہے۔ اس لیے صحابہ و تابعین جیسے اہلِ بصیرت و صاحبِ عرفاں گروہ سے بہت بعید تھا کہ قلم کی اہمیت سے غافل رہتے اور حدیثِ نبوی جو قرآن کے بعد تمام علوم آسمانی و ارضی میں سب سے اشرف و بزرگ علم ہے، اس کو ضبطِ تحریر میں نہیں لاتے۔ لہٰذا جیسا کہ واقعات بھی تائید کرتے ہیں، حدیثوں کے متعدد نسخے پہلی صدی کے اختتام سے پیشتر ہی صحابہ اور تابعین نے مدون کر لیے تھے۔ حضرت عمر بن عبد العزیز جو اُموی دورِ ملوکیت میں آفتابِ عدل بن کر چمکے اور انھوں نے مروانی

۸۵۔ اصولِ حدیث کی کُتب میں اسے بروایاتِ مختلفہ حدیث بھی کہا گیا ہے۔ جب کہ امیر المؤمنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے علاوہ یہ قول حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: 'المحدث الفاصل بین الراوی والواعی' للرامہرمزی، و'ناسخ الحدیث ومنسوخہ' لابن شاہین، و'الجامع لاخلاق الراوی وآداب السامع' للخطیب وغیرہ۔

۸۶۔ ارشاد ہوتا ہے:

اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ○ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ○ [العلق ۹۶: (۳۔۴)]

ترجمہ: "آپ پڑھیں، آپ کا رب ہی سب سے زیادہ کریم ہے، جس نے قلم سے لکھنا سکھایا۔

خاندان کے سرپر خدمتِ اسلام کا تاج رکھا، انھوں نے ۹۹ھ میں خلافت کی ذمہ داریاں قبول کیں اور ۱۰۰ھ میں مُنعمِ حقیقی کی سرکار سے انعام لینے کے لیے روانہ ہوگئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بزرگ سریرِ خلافت پر صرف اس لیے لائے گئے تھے کہ اپنے جدِ بزرگوار عمرِ اول کی طرح جنھوں نے آئندہ کے لیے قرآن مجید کو محفوظ کیا، عمرِ ثانی تعلیماتِ مصطفوی کے دوسرے حصّے یعنی حدیثوں کو محفوظ کردیں۔

اس ڈھائی برس کی مدت میں جو خلافتِ صدیقی کی ہموزن تھی، ابن عبد العزیز نے سب سے بڑا کام یہی کیا کہ حدیثوں کے تمام منتشر مجموعوں کو سرکاری دفتر میں اکٹھا کرلیا اور اپنے ایک فرمان کے ذریعہ مملکتِ اسلامی کے سارے عاملوں، والیوں اور عہدہ داروں کو حکم بھیجا کہ صحابہ و تابعین کے تمام مجامیع دارالخلافہ میں بھیج دیے جائیں۔

عمر بن عبد العزیز خود بھی تابعی تھے، دین دار تھے، خلیفۂ راشد تھے، تابعین کا بڑا گروہ ابھی زندہ تھا، صحابہ کو رخصت ہوئے بھی اتنے دن نہیں گزرے تھے کہ ان کی روایتیں فراموش کردی جائیں، یا ان کے مجموعوں میں موضوع روایات کی آمیزش ہوسکے۔ اپنے اس طریق کار اور بروقت خبر گیری سے عمر ثانی نے قرآن کی طرح قیامت تک کے لیے حدیثوں کی حفاظت کا انتظام کردیا، اب حدیثیں محض زبانی روایت سے مضبوط حافظے ہی کے سہارے محفوظ نہیں تھیں، بلکہ صحابہ کی اولاد تابعین و تابعین کے اساتذہ کے موروثی نسخوں کے علاوہ تمام محفوظ حدیثیں مرکز میں منتقل ہوکر سرکاری ریکارڈ بن گئی تھیں۔

اسی لیے واضعینِ حدیث نے بعد میں جب اپنے جعلی سکّے چلائے، تو جلد ہی پکڑ لیے گئے اور محدثین نے موضوعات و ضعفاء کے زیرِ عنوان ایسے رُواۃ اور ان کے جعلی سکوّں کی قلعی کھول دی۔ اگر عمر بن عبد العزیز کی پیش بینی نہ ہوتی اور حدیثوں کے مجموعے

سرکاری ریکارڈ نہ بن گئے ہوتے، تو پھر ہمیشہ کے لیے ناممکن تھا کہ صحیح و موضوع روایتوں میں تمیز کی جاسکتی اور عادل و کذاب راویوں کی شناخت ہوتی۔ محدثین بہر حال غیر معصوم انسان تھے، اللہ کی طرف سے ان کے پاس کوئی وحی نہیں آتی تھی، جس سے نقد و انتخابِ حدیث ممکن ہوتا۔ یہ عمر ثانی کی روشن دینی خدمت کا نتیجہ ہے کہ آج تک اس کی شعاعوں میں حدیثیں پرکھی جاتی ہیں۔

پہلی صدی ہجری کے چند مجامیعِ حدیث

گذشتہ صفحات میں صحابۂ کرام کے تمام مرتبہ نسخہ ہائے حدیث کا ذکر تو نہیں ہوا ہے اور نہ ان نسخوں کے متعلق تفصیل بیان مقصود ہے۔ بطور اظہار مدعا یا کتابتِ حدیث کے سلسلے کی ایک کڑی کی حیثیت سے چند صحابیوں کے مجموعے کا نام لے لیا گیا تھا۔ اس لیے یہاں ان کا اعادہ چنداں ضروری نہیں۔

لیکن صحابہ کے سامنے ان کے شاگردوں یعنی تابعین نے جو مختلف مجموعے مرتب کیے اور پہلی ہی صدی ہجری میں احادیث نبوی کے جو مستند ذخیرے فراہم ہوگئے، ان کا یہاں ذکر بہت اہم ہے کیونکہ سلسلۂ کتابت کی دوسری کڑی تابعین کے مجموعے ہیں۔

اس مختصر فہرست کو دیکھ کر آپ اندازہ کر سکیں گے کہ ضبطِ حدیث کا کام کس قدر معتبر اور مستند ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حدیثیں کتابی صورت میں امام بخاری اور امام مسلم کی یادگار ہیں اور یہ تیسری صدی ہجری کے کارنامے ہیں، حقیقت سے کتنے ناواقف اور واقع سے کتنے نابلد ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ عہدِ رسالت سے آج تک کوئی دور ایسا نہیں گزرا، جس میں حدیثیں کتابی صورت میں موجود نہ تھیں۔

ہُمام بن منبہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرویات جمع کی تھیں اور وہ نسخہ برلن لائبریری میں محفوظ ہے [۸۷]۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مرویات حضرت عروہ نے مرتب کرلی تھیں۔ حضرت عروہ آپ کے حقیقی بھانجے اور زبیر بن عوّام عشری صحابی کے صاحب زادے ہیں۔ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی تمام روایتیں ان کے متعدد شاگردوں نے اُنھیں کے سامنے مرتب کرلی تھیں۔ مذکورہ چند ناموں کے علاوہ متعدد صحابہ کے کئی شاگردوں نے اپنے اُستاد کی روایتیں کتابی صورت میں جمع کرلی تھیں اور جب عمر بن عبد العزیز کا فرمان جاری ہوا، تو وہ تمام نسخے نقل ہو کر مرکزِ خلافت میں پہنچ گئے۔

یہ پہلا موقع تھا جب اسلامی حکومت نے اس اہم دینی مسئلے کی طرف توجہ کی۔ حکومت کا یہ اقدام محض مجموعوں کو ایک جگہ جمع کرلینے کے لیے تھا۔ رہی ان مجموعوں کی فنی ترتیب و تبویب، تو اس کے لیے حکومت نے نہ کوئی ہدایت جاری کی اور نہ اس وقت ان کی طرف کسی کا خیال جاسکتا تھا۔ زمانہ جوں جوں آگے بڑھتا جاتا ہے، انسان علم و فن کی آراستگی و تہذیب نئے حالات کے مطابق کیا کرتا ہے۔ خلافتِ صدیقی میں صرف قرآن مجید کی تحریری حفاظت کی طرف خیال کیا گیا، تاکہ سرکاری مصحف میں قرآن مجید کی تمام آیات اور سورتیں محفوظ ہو جائیں اور دیگر اصحابِ رسول علیہ السلام کی بیاضوں اور کشکولوں کی وجہ سے کتاب اللہ کی کوئی آیت مشتبہ اور مشکوک نہ ہو، لیکن خلافتِ عثمانی میں تلاوت

۸۷۔ الحمد للہ یہ ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم کی تحقیق و تقدیم کے ساتھ 'صحیفہ ہمام بن منبہ' کے نام سے پہلے پہل ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا، اب تک اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اب یہ عربی متن کے ساتھ، اردو اور انگریزی ترجمے میں بھی دستیاب ہے۔ محقق عفی عنہ

وقراءت کو سامنے رکھ کر جمع وحفاظت قرآن کا انتظام کیا گیا۔ مابعد دونوں میں اعجام واعراب کا اضافہ ہوا۔ پھر آیتوں کی تعداد ہر سورہ کی لوح پر درج کرنے لگے اور اب تو تعداد حروف وحرکات کی طرف اہلِ خیر متوجہ ہیں وغیرہ وغیرہ۔

اسی طرح جمعِ حدیث کا کام بھی بتدریج قرآنی نہج پر ہوا، پہلے منتشرہ حدیثیں مرکزِ خلافت میں پہنچیں، پھر بلحاظِ رُواۃ ان کی ترتیب ہوئی اور مسانید عالمِ وجود میں آئیں، یعنی ہر صحابی کی تمام مرویات ایک جگہ اکٹھی کر دی گئیں، پھر فقہی ترتیب کا دور آیا، پھر باعتبارِ سند حالاتِ رُواۃ، صحیح وضعیف کی نشاندہی کی گئی، تخریج واستدراک کا کام ہوا، اور ان ادوار کے بعد توفیق وتطبیق اور ترجیح میں آج تک علمائے اَعلام مشغول ہیں۔ اور اب تو دنیا کے سامنے نئے نئے معاشی ومعاشری مسائل ووسائل پیدا ہو گئے ہیں، ان شاء اللہ تعالیٰ ان نئے حالات ومشکلات کے حل کے لیے جب اہلِ دین کوشش کریں گے، تو حدیثوں کی خدمت کے لیے اور نئی راہیں پیدا ہو جائیں گی۔

حاصلِ کلام

گذشتہ تفصیل کے بعد اس کی ضرورت نہیں تھی کہ حدیثوں کی کتابت کے متعلق مزید لکھا جائے، کیونکہ اس مقالہ کا موضوع تدوینِ حدیث کی تاریخ اور عہد بعہد کی تبدیلیاں نہیں ہیں، بلکہ اصل غرض یہ ہے کہ جو لوگ اپنی ناواقفیت کی وجہ سے حدیثوں کی اہمیت نہیں جانتے اور ان کے شرعی حُجت ہونے کا انکار کرتے ہیں، ان کو اور ان جیسے دوسروں کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ حدیثوں کے مجموعے علمائے اسلام کے خود ساختہ نہیں ہیں اور نہ ان کی ترتیب وتدوین محض علمی حوصلہ مندی کی وجہ سے ہوئی ہے، یعنی جس طرح تاریخ وجغرافیہ، حکمت وریاضی کی طرف مسلمان اہلِ فکر واہلِ قلم متوجہ ہوئے، اسی

طرح ان روایتوں کے میدان میں بھی ان کے تَوسَن فکر[۸۸] واشہب قلم نے جوہر دکھائے، حقیقت یہ ہے کہ جب صغار صحابہ کچھ بڑے ہوئے اور نئی قومیں اسلام میں داخل ہوئیں، تو فطری طور پر ان کے دلوں میں حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت پاک جاننے کا شوق پیدا ہوا، دوسری طرف صغار صحابہ نے انھیں قرآن مجید کی تعلیم دی اور ہر حکم کی تشریح کے لیے حضور اکرم علیہ السلام کے اقوال وافعال سنائے، آپ کے ہر قول وفعل سے متعلق محل ومقام کا ذکر کیا اور یہ حضرات حضور اکرم علیہ السلام کی سیرت وسنت کا مشاہدہ عینی شاہد بن کر فرماتے کہ فلاں مقام پر مجھے یا فلاں رفیقِ صحبت کو یہ بات پیش آئی اور حضور علیہ السلام نے اس طرح ہماری ہدایت فرمائی۔ صغار صحابہ اور تابعین اپنے بزرگوں سے جو سُنتے اُن کو قیدِ تحریر میں لاتے، کیونکہ آنکھوں دیکھا حال انسانوں کے ذہن میں مدتوں نقش رہتا ہے، مگر سُنی سنائی باتوں کا قیام محض قوتِ حافظہ پر موقوف ہے، اس لیے سلسلۂ حدیث کے راوی ثانی یعنی صغار صحابہ وتابعین حدیثوں کی کتابت میں زیادہ پیش پیش نظر آتے ہیں۔

سُنّتِ نبوی سے متعلق ہر گوشہ چونکہ اسلامی ہدایت کا ایک اہم رکن تھا، خیر القرون کا ہر فرد اس کی تعمیل وتحفظ میں مشغول ہو گیا۔ جس کسی نے اسلام کا اقرار کیا، اس نے ساتھ ہی ساتھ ان ہدایتوں پر عمل کرنا بھی اپنا فرض سمجھا، جو حضور کے نام سے صحابۂ کرام نئی نسلوں کو دے رہے تھے، اس دوسرے طبقے نے ان روایتوں کو طیبِ خاطر اور انشراحِ قلب کے ساتھ قبول کیا۔ بعضوں کا قبول صرف اپنی ذات تک محدود رہا اور بعضوں

۸۸؎ توسن: اردو میں تند وتیز گھوڑے کو کہا جاتا ہے۔ (ملاحظہ ہو اردو لغت)
یہاں 'توسن فکر' سے مراد اعلیٰ وعمدہ فکر ہے۔ محقق عفی عنہ

نے ان روایتوں کو اپنے لیے بھی قبول کیا اور اپنے بعد والوں کے لیے بھی قبول کیا، یعنی انھوں نے اپنی زندگیاں طلب وروایتِ حدیث، پھر ان کے جمع وکتابت میں صرف کردیں۔ تابعین احادیثِ نبوی کے علاوہ صحابۂ رسول ﷺ کے اقوال وفتاویٰ بھی جمع کرنے لگے، کیونکہ صحابۂ کرام کے اقوال وفتاویٰ کی مدد سے قرآن وسنت نبوی کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی تھی۔ صحابۂ کرام کی تشریحات بطور خود دینی حجت نہ سہی، مگر دین کی تعمیر میں ان کو بڑا دخل تھا۔ مشکوٰۃ نبوت سے جو تجلیات حاصل ہوئی تھیں، صحابۂ کرام کے اقوال وفتاویٰ میں ان کی چمک صاف نظر آرہی تھی۔ صحابۂ کرام خود صاحبِ الہام نہیں تھے، مگر دین کی روایت میں ان کی زندگی اِلہامِ نبوی ﷺ کے سراسر تابع تھی۔ صحابۂ کرام اپنی مرویات اور اپنے فتاوے کی اہمیت اچھی طرح جانتے تھے، اسی لیے ان بزرگوں میں سے جنھوں نے خود کوئی کتابی ذخیرہ مرتب نہیں کیا، وہ اپنے تلامذہ سے یہ کام لینے لگے۔ چنانچہ ان کے شاگرد اپنے اساتذہ کے راوی بھی تھے اور کاتب ومنشی بھی۔ گذشتہ اوراق میں ضمناً چند صحابۂ کرام اور ان کے تلامذہ کے صحفِ روایات کے تذکرے کے بعد ایک غیر جانب دار وطالبِ حق بآسانی حدیثوں کی محفوظیت کا اقرار کرلے گا۔

عمر ثانی کے ساتھ تعاون

جب عمر بن عبدالعزیز نے سرکاری فرمان جاری کیا اور وہ مُستقرِ خلافت میں حدثیوں کے مجموعے فراہم کرنے لگے، تو ہمارے پاس اس بات کی بھی قابلِ وثوق شہادتیں موجود ہیں کہ قوم نے اس اہم دینی اقدام میں ان کے ساتھ پورا پورا تعاون کیا۔ عمر ثانی کو اپنے مقصد برآری میں کسی قسم کی رکاوٹ کا سامنا نہیں ہوا۔ بلکہ اجلہ تابعین نے جن میں ابو بکر بن محمد متوفیٰ ۱۲۰ھ اور محمد بن مسلم نے سن ۵۰ھ تا ۱۲۴ھ میں بڑی ہمت دکھائی۔

اساطین اسلام واحیائے حدیث

حدیثوں کی حفاظت اور ان کو زندہ رکھنے کا خیال عمرِ ثانی کا اختراع نہیں ہے، انھوں نے حفاظتِ حدیث کی ایک نئی راہ نکالی، ورنہ جہاں تک اصل مسئلہ یعنی حفاظتِ حدیث کا تعلق ہے، اس کے لیے صریح حکم حضرت علی ابن ابی طالب بہت پہلے دے چکے تھے: قال: «تَزَاوِرُوْا وَأَكْثِرُوْا مُذَاكَرَةَ الحَدِيْث، فإِنَّكُمْ إِنْ لَمْ تَفْعَلُوْا يَنْدَرِسُ الحَدِيْثُ»[89].

یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ ایک دوسرے سے ملاقات کیا کرو اور زیادہ سے زیادہ حدیثوں کا تذکرہ کرو، اگر تم لوگوں نے ایسا نہ کیا، تو حدیثیں گم ہو جائیں گی۔

ذرا غور فرمایئے کہ اگر حدیثوں کی دینی اہمیت نہ تھی، تو خلیفۂ برحق علی رضی اللہ عنہ نے ان کے زندہ رکھنے اور یاد کرنے کا حکم کیوں دیا تھا۔۔۔!

اسی طرح امام مالک ابن شہاب کا قول نقل کرتے ہیں کہ قال ابنُ شهاب: «إِنَّ هَذَا الْعِلْمَ أَدَبُ اللهِ الَّذِي أَدَّبَ بِهِ نَبِيَّهُ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَأَدَّبَ النَّبِيُّ عَلَيْهِ السَّلَامُ أُمَّتَهُ، وَهُوَ أَمَانَةُ اللهِ إِلَى رَسُولِهِ لِيُؤَدِّيَهُ عَلَى مَا أُدِّيَ إِلَيْهِ»[90].

۸۹۔ ملاحظہ ہو: 'تاریخ دمشق لابن عساکر'، ج۵، ص۳۴۴۔

۹۰۔ ملاحظہ ہو: 'الجامع لاخلاق الراوی وآداب السامع' للخطیب، ج۱، ص۷۸، و'الالماع الیٰ معرفۃ اصول الروایۃ وتقیید السماع' للقاضی عیاض، ص۲۱۳۔ ان دونوں میں آخر میں درج ذیل کلمات بھی ہیں:

«فَمَنْ سَمِعَ عِلْمًا فَلْيَجْعَلْهُ إِمَامَهُ وحُجَّةً فِيمَا بَيْنَهُ وَبَيْنَ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ».

یعنی: ''پس جو کوئی علم کی بات سُنے اُسے اپنے لیے رہ نما اور اپنے اور اللہ عزوجل کے درمیان حجت بنالے''۔

یعنی: ابن شہاب نے کہا کہ یہ علم (حدیث) اللہ کا ادب ہے، جو اس نے اپنے نبی کو سکھایا اور آنحضرت ﷺ نے اس سے اپنی اُمت کو آراستہ کیا۔ سنتِ نبوی اللہ کی امانت ہے، اللہ نے اپنے نبی علیہ السلام کو اس لیے عطا کیا کہ وہ دوسروں تک اس اَمانت کو پہنچادیں۔

....

باب نہم
'صحاح ستّہ سے قبل کی کتبِ روایت'
(بخاری و مسلم سے پیشتر کے مجامیع حدیث)

راویان حدیث صحابۂ کرام کا شمار پانچ ہزار سے بھی زیادہ ہے اور خود خانوادۂ نبوت سے تعلق رکھنے والے یعنی اہل بیت اور ان کی مفتخر اولاد میں تقریباً دو سو افراد سے حدیثیں روایت کی گئی ہیں۔ اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ دیگر صحابۂ کرام کی اولاد اور نو مسلم تابعین ان کے تلامذہ اور ان کی اولاد کا کیا شمار ہو گا اور جس علم کی طرف اتنی بڑی جماعتیں متوجہ ہوں اس علم کی حفاظت واشاعت میں کیا شک وشبہہ کی گنجایش رہ سکتی ہے۔

عمر ثانی کا فرمان

كَتَبَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ رَحِمَهُ اللهُ عَلَى رَأْسِ الـمِائَةِ إِلَى أَبِي بَكْرِ بْنِ عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ عَامِلِهِ وَقَاضِيهِ عَلَى المدِيْنَةِ: «انْظُرْ مَا كَانَ مِنْ حَدِيثِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاكْتُبْهُ لِي، فَإِنِّي قَدْ خِفْتُ دُرُوسَ الْعِلْمِ وَذَهَابَ الْعُلَمَاءِ»[91]. وَأَوْصَاهُ أَنْ

---

[91] ملاحظہ ہو: 'صحیح البخاری'، ترجمۃ الباب، ج۱، ص۱۳۱۔ و'موطأ امام مالک'، ج۱، ص۳۳۰، رقم: ۹۳۶، و'سنن الدارمی'، ج۱، ص۴۳۰، رقم: ۵۰۴۔ 'موطأ امام مالک' رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ یوں ہیں:
أَخْبَرَنَا مَالِكٌ أَخْبَرَنَا يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ أَنَّ عُمَرَ بْنَ عَبْدِ الْعَزِيزِ كَتَبَ إِلَى أَبِي بَكْرِ بْنِ عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ: «انْظُرْ مَا كَانَ مِنْ حَدِيثِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَوْ سُنَّتِهِ أَوْ حَدِيثِ عُمَرَ أَوْ نَحْوِ هَذَا فَاكْتُبْهُ لِي، فَإِنِّي قَدْ خِفْتُ دُرُوسَ الْعِلْمِ وَذِهَابَ الْعُلَمَاءِ».

=

يَكْتُبَ لَهُ مَا عِنْدَ عُمْرَةَ بِنْتِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ الأَنْصَارِيَةِ (م ٩٨ھ) وَالْقَاسِمِ مُحَمَّدِ بْنِ أَبِي بَكْرٍ (م ١٢٨ھ) وَكَذٰلِكَ كَتَبَ إِلَى عُمَّالٍ فِي أُمَّهَاتِ الـمُدُنِ الْإِسْلَامِيَةِ بِجَمْعِ الحَدِيْثِ وَمِمَّنْ كَتَبَ إِلَيْهِ مُحَمَّدُ بْنُ مُسْلِمٍ الزّهْرِي المَدَنِي [٩٢].

یعنی: ”سن ١٠٠ھ کے شروع میں عمر بن عبد العزیز نے ابو بکر بن عمرو بن حزم کو لکھا، جو ان دونوں مدینہ کے عامل اور قاضی تھے، کہ دیکھو حضور اکرم علیہ السلام کی جو حدیثیں ہیں، ان کو لکھ لو، ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ علماء کے ساتھ علم بھی رخصت ہو جائے گا اور انھوں نے تاکید کی کہ حضرت عمرہ بنت عبد الرحمٰن انصاریہ (م ٩٨ھ) کا مجموعہ نقل کر کے مرکزِ خلافت میں بھیج دیں اور حدیثوں کے وہ تمام ذخیرے جو قاسم بن محمد بن ابی بکر (م ١٠٨ھ) کے پاس ہیں ان کو بھی نقل کر لیا جائے“۔ عمر بن عبد العزیز نے جس طرح عاملِ مدینہ کو لکھا مملکتِ اسلامی کے تمام بڑے شہروں کے عاملوں کو بھی اسی طرح حدیثیں جمع کرنے کی ہدایتیں بھیجیں [٩٣]۔

=

یعنی: ”امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہمیں یحییٰ بن سعد نے خبر دی کہ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ نے عاملِ مدینہ ابو بکر بن عمرو بن حزم کو یہ پیغام لکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث یا آپ کی سُنت، حضرت عمر کی حدیث یا اسی طرح دیگر کی احادیث کو دیکھو اور اُنھیں میری طرف لکھ بھیجو، کیوں کہ مجھے اندیشہ ہے کہ علما کے جانے سے یہ علم نہ چلا جائے“۔

٩٢ ملاحظہ ہو: ’الطبقات الکبریٰ‘، ج ٢، ص ٢٩٥۔ و ’الوسیط فی علوم و مصطلح الحدیث‘، ص ٦٥۔

٩٣ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ نے صرف عُمالِ حکومت کو احادیث مدون کرنے کا حکم نہیں دیا بلکہ آپ خود بھی احادیث لکھا کرتے تھے۔ حضرت ابو قلابہ سے روایت ہے فرمایا: حضرت عمر بن عبد العزیز نمازِ ظہر کے لیے باہر تشریف لائے تو ان کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا، پھر عصر کے لیے تشریف لائے تو پھر

=

حکومت کی اس دلچسپی کے بعد حدیثوں کے جمع و تالیف کا کام زیادہ محفوظ بنیاد پر ہونے لگا۔ اب تک حدیثوں کے جو کچھ کتابی ذخیرے صحابہ و تابعین کے گھروں میں رکھے ہوئے تھے، نقل ہو کر مستقرِ خلافت میں پہنچ گئے اور عمر ثانی کی تنبیہ کے بعد دوسرے راویانِ حدیث نے بھی حدیثیں لکھنا شروع کر دیں۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

ابن جریج ۸۵۔۱۵۰ھ، ربیع بن صبیح ۱۶۰ سنہ، سعید بن عروبہ ۱۵۶ سنہ، حماد بن سلمہ ۱۶۷ سنہ، اوزاعی ۸۵۔۱۵۷ھ، معمر ۱۵۳ سنہ اور محمد بن عبد الرحمٰن ۷۲۔۱۴۸ھ۔

اس دور میں اور اس کے بعد بخاری و مسلم سے پہلے جو کتابیں مرتب ہوئیں، ان میں سے چند کے نام درج کیے جاتے ہیں۔ ان مؤلفین اور ان کی تعلیمات کی واقفیت بہرحال مفید ہے:

۱۔ سفیان ثوری: "کتاب جامع کبیر"، "کتاب جامع صغیر"، "کتاب الفرائض"۔

۲۔ ابو عبد الرحمٰن محمد بن عبد الرحمٰن ۷۴۔۱۴۸ھ: "کتاب السنن۔

۳۔ عبد الرحمٰن بن زید: "کتاب الناسخ والمنسوخ"، "کتاب التفسیر"۔

۴۔ عبد الرحمٰن بن ابی الزناد ۱۰۰۔۱۷۴ھ: "کتاب الفرائض"، "کتاب رأی الفقہاء"

۵۔ عبد الملک بن محمد متوفیٰ ۱۷۶ سنہ: "کتاب المغازی"۔

۶۔ عبد الملک بن جریج: "کتاب السنن"۔

=

بھی وہ کاغذ ان کے پاس تھا، میں نے عرض کی: امیر المؤمنین! یہ کتاب کیسی ہے؟ فرمایا: یہ حدیث پاک ہے، جو عون بن عبد اللہ نے مجھے سُنائی، مجھے یہ حدیث پاک بہت پسند آئی اور میں نے اس کو لکھ لیا"۔ (ملاحظہ ہو سیرت ضیاء النبی ﷺ، ج۷، ص۱۳۸۔۱۳۹)۔

۷۔ زائد بن قدامہ متوفیٰ ۱۶۱ھ: ”کتاب السنن“۔

۸۔ محمد بن فضل متوفیٰ ۱۵۹ھ: ”کتاب الطہارۃ“، ”کتاب الصلوٰۃ“، ”کتاب الزکوٰۃ“، ”کتاب المناسک“، ”کتاب السنن“۔

۹۔ یحییٰ بن زکریا متوفیٰ ۱۸۳ھ: ”کتاب السنن“۔

۱۰۔ وکیع بن جراح متوفیٰ ۱۹۷ھ: ”کتاب السنن“۔

۱۱۔ ابو نعیم فضل بن دُکین ۲۱۷ھ: ”کتاب المناسک“، ”کتاب المسائل“۔

۱۲۔ عبد اللہ بن مبارک: ”کتاب السنن“۔

۱۳۔ ابو عبد اللہ فیریابی کبیر: ان کا مجموعہ روایت تمام فقہی ابواب پر حاوی ہے۔

۱۴۔ عبد اللہ بن محمد متوفیٰ ۲۳۵ھ: ”کتاب السنن“، ”کتاب المسند“۔

۱۵۔ عثمان بن ابی شیبہ متوفیٰ ۲۳۵ھ: ”کتاب السنن“، ”کتاب المسند“۔

۱۶۔ محمد بن عثمان متوفیٰ ۱۹۷ھ: ”کتاب السنن“۔

۱۷۔ احمد بن محمد بن ہانی: ”کتاب السنن“، ”کتاب الناسخ والمنسوخ فی الحدیث“۔

۱۸۔ احمد بن محمد المروزی: ”کتاب السنن بشواہد الحدیث“۔

۱۹۔ اسحٰق بن راہویہ: ”کتاب السنن“۔

۲۰۔ علی بن مدینی ۱۸۱۔۲۵۰ھ: ”کتاب المسند“، ”کتاب المدلسین“، ”کتاب الضعفاء“، ”کتاب العلل“۔

۲۱۔ سریح ابن یونس: ”کتاب السنن“۔

۲۲۔ ابو عمرو حفص: ”کتاب السنن“۔

۲۳۔ ابراہیم بن اسحٰق متوفیٰ ۲۵۸ھ: ''کتاب غریب الحدیث''، ''مسند ابی بکر''، ''مسند عمر''، ''مسند عثمان''، ''مسند علی''، ''مسند زبیر''، ''مسند طلحہ''، ''مسند سعد بن ابی وقاص''، ''مسند عبدالرحمٰن بن عوف''، ''مسند عباس''، ''مسند شیبہ بن عثمان''، ''مسند عبد اللہ بن جعفر''، ''مسند مسور بن مخرمہ زہری''، ''مسند مطلب بن ربیعہ''، ''مسند سائب مخزومی''، ''مسند خالد بن ولید''، ''مسند ابی عبیدہ بن جراح''، ''مسند معاویہ''، ''مسند عمرو بن عاص''، ''مسند عبداللہ بن عباس''، ''مسند عبداللہ بن عمر''، ''مسند الموالیٰ''۔

۲۴۔ مطبین بن ایوب متوفیٰ ۲۹۸ھ: ''کتاب السنن''، ''کتاب المسند''، ''کتاب تفسیر المسند''۔

۲۵۔ فیریابی صغیر متوفیٰ ۳۰۰ھ: ''کتاب السنن''، جو پچاس ابواب پر مشتمل ہے۔

۲۶۔ ابو مسلم حجی: ''کتاب المسند''، ''کتاب السنن''۔

۲۷۔ یحییٰ بن آدم متوفیٰ ۲۰۳ھ: ''کتاب الخراج''، ''کتاب الفرائض''۔

۲۸۔ سعید بن ابی عروبہ متوفیٰ ۱۵۶ھ: ''کتاب السنن''۔

۲۹۔ حماد بن سلمہ متوفیٰ ۱۶۵ھ: ''کتاب السنن''۔

۳۰۔ اسماعیل بن عُلیہ ۱۱۶۔۱۹۳ھ: ''کتاب التفسیر''، ''کتاب الصلوٰۃ''، ''کتاب الطہارت''، ''کتاب المناسک''۔

۳۱۔ ابراہیم بن اسماعیل ۱۵۲۔۲۱۸ھ

۳۲۔ بروح بن عبادہ متوفیٰ ۲۰۷ھ: ''کتاب السنن''۔

۳۳۔ مکحول شامی متوفیٰ ۱۱۳ھ: ''کتاب السنن''، ''کتاب المسائل''۔

۳۴۔ اوزاعی ۵۸۔۱۵۷ھ: ''کتاب السنن''، ''کتاب المسائل''۔

۳۵۔ ولید بن مسلم متوفیٰ ۱۹۴ھ: ”کتاب السنن“، ”کتاب المغازی“۔

۳۶۔ عبد الرزاق بن ہمام متوفیٰ ۲۱۱ھ: ”کتاب السنن“، ”کتاب المغازی“۔

۳۷۔ ہشیم بن بشیر متوفیٰ ۱۸۳ھ: ”کتاب التفسیر“، ”کتاب السنن“، ”کتاب القراءت“۔

۳۸۔ یزید بن ہارون متوفیٰ ۲۰۶ھ: ”کتاب الفرائض“۔

۳۹۔ ”اسحاق الارزق متوفیٰ ۱۹۵ھ: ”کتاب المناسک“، ”کتاب الصلوٰۃ“۔

۴۰۔ عبو الوہاب بن عطاء متوفیٰ ۲۰۰ھ: ”کتاب السنن“۔

۴۱۔ ابراہیم بن طہمان: ”کتاب السنن“۔

۴۲۔ سفیان بن عیینہ ۱۰۷۔۱۹۸ھ وغیرہم۔

اسمائے مذکورہ بالا میں چاروں امام اور ان کے مشہور تلامذہ کے مجموعے درج نہیں کیے گئے، کیونکہ ان کی تصانیف اور اس سلسلے کے مصنفین سے لوگ اچھی طرح واقف ہیں اور یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ ائمۂ اربعہ پہلی صدی ہجری کے آخر سے تیسری صدی ہجری کے اوائل تک اپنی روایتی وفقہی خدمات کی وجہ سے مرکزِ دین بنے رہے اور ان کے بعد ان کے تلامذہ مسلسل آج تک حدیث وفقہ کی خدمت میں مشغول ہیں۔ امام ابو حنیفہ کی ولادت ۸۰ھ میں ہوئی، امام مالک ۹۳ھ میں پیدا ہوئے۔ امام شافعی ۱۵۰ھ میں خاکدانِ ارضی کے رونق بخش بنے اور امام احمد بن حنبل ۱۲۴ھ مطلعِ وجود پر نمودار ہوئے۔

یہ ایک نہایت مختصر فہرست ہے۔ امام بخاری و مسلم سے پیشتر جو حدیثوں کے مجموعے مرتب ہوئے، ان کی تفصیلی تذکرے کی یہاں گنجائش نہیں ہے اور آج بھی اس مبارک عہد کی اکثر تالیفات موجود ہیں۔

روایتِ حدیث، راویوں کی عمر کے لحاظ سے

سطورِ بالا میں نمونے کے طور پر جمع و تدوین کا ذکر تھا، اگر ان تالیفی خدمات کے ساتھ راویوں کی عمروں کا سلسلہ بھی پیش نظر رہے، تو ہمیں یقین ہے کہ اُمتِ مسلمہ نہ صرف حدیثوں کی اہمیت کا اقرار کرے گی، بلکہ اپنے اسلاف کے دینی کارناموں پر فخر کرے گی اور یہ جان سکے گی کہ اسلام کو دنیا کے دوسرے مذاہب پر برتری و تفوق کس طرح حاصل ہے۔ اسلام سے متعلق ہر چھوٹی بڑی بات کیونکہ محفوظ رہی اور حضور اکرم علیہ السلام کی سنت کو حرزِ جان بنایا گیا۔ دنیا کی دوسری قومیں اپنی بنیادی کتابوں کی حفاظت سے غافل رہیں، یہاں تک کہ ان کے دین کے سارے مکتوب ذخیرے مشتبہ و مشکوک ہو کر رہ گئے۔

جب وہ لوگ کتابوں کی صحیح حفاظت میں ناکام رہے، تو اس کی توقع عبث ہے کہ ان کے بانیانِ مذہب کی سوانح حیات محفوظ رہ سکتی ہیں۔ مگر یہ سعادت صرف مسلمانوں کی قسمت میں لکھی ہوئی تھی کہ الہامی کتاب کے ساتھ اس کی زبانی اور عملی تفسیریں بھی محفوظ رہیں، چنانچہ دینِ مبین کے مخلص پیروؤں نے اپنے ہادیِ برحق کی مکمل سوانح حیات کی حفاظت کی اور عہد بعہد زبانی اور کتابی دونوں طریقے سے ان کو منتقل کر کے ہم تک پہنچا دیا۔ فَجَزَاهُمُ اللّٰهُ تَعَالٰی خَیْرًا الجَزَاء.

تسلسلِ روایت

ذیل میں عہدِ سیدنا عثمان سے لے کر ۳۰۰ھ تک چند راویانِ حدیث کے سنینِ وفات درج کیے جاتے ہیں، تاکہ روایتوں کے تسلسل کا ایک اندازہ ہو اور یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہر سنہ میں نئی شخصیتیں وجود میں آئیں اور ہر سال راویوں کی ایک جماعت ہم سے

رخصت ہوتی گئی، جن کے نام، حالات، مدتِ زندگی، علمی خدمات، دین کے ساتھ وابستگی کے تذکرے کتابوں میں محفوظ ہیں۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ کئی لاکھ راویوں کے مفصل حالات یہاں لکھے جائیں، چند ناموں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

عہدِ عثمانی میں وفات پانے والے چند صحابۂ کرام

۱۔ سراقہ بن مالک، ۲۔ جبار بن صخر، ۳۔ حاطب بن ابی بلتعہ، ۴۔ عیاض بن زہیر، ۵۔ ابو رشید ساعدی، ۶۔ اوس بن صامت، ۷۔ حرث بن نوفل، ۸۔ عبد اللہ بن حذافہ، ۹۔ زید بن خارجہ، ۱۰۔ لبید بن ربیعہ، ۱۱۔ مسیب، ۱۲۔ معاذ بن عمرو، ۱۳۔ ابولبابہ، ۱۴۔ نعیم بن مسعود وغیرہ رضی اللہ عنہم۔

عہدِ حیدری میں وفات پانے والے چند صحابۂ کرام

۱۔ حذیفہ بن یمان، ۲۔ زبیر بن عوام، ۳۔ طلحہ، ۴۔ سلمان فارسی، ۵۔ ابو میسرہ بدری، ۶۔ صفوان بن عسال، ۷۔ تمیم داری وغیرہم رضی اللہ عنہم (کئی ہزار صحابہ وتابعین نے انتقال کیا)۔ اسی طرح پہلی صدی ہجری کے آخری دنوں تک سال بہ سال صحابۂ کرام رخصت ہوتے رہے، ذیل میں ۶۱ھ یعنی شہادت امام حسین رضی اللہ عنہ کے سال سے مابعد دوسو چالیس برس کی وفیات درج کی جاتی ہیں:

علقمہ ۶۱ھ، مسروق ۶۲ھ، عبیدہ ۷۳ھ، عمرو بن میمون ۷۴ھ، اسود بن یزید ۷۵ھ، سوید بن غفلہ ۸۰ھ، محمد ابن حنفیہ ۸۰ھ، شریح بن حارث ۷۸ھ بعمر ۱۰۸ سال، عبد الرحمٰن بن ابی لیلیٰ ۸۳ھ، عمرو بن حریث ۸۵ھ، علی بن حسین (امام زین العابدین) ۹۲ھ، انس بن مالک صحابی، ۹۳ھ، سعید بن جبیر ۹۵ھ، ابراہیم بن زید ۹۶ھ، سالم بن ابی جند

۹۷ھ، ابو خالد والبی ۱۰۰ھ، عمر بن عبد العزیز ۱۰۱ھ، مجاہد ۱۰۲ھ شعبی ۱۰۴ھ، ضحاک ابن مزاحم ۲۰۵ھ، طاؤس وسالم بن عبد اللہ ۱۰۶ھ، محمد بن کعب قرضی ۱۰۸ھ، حسن بن یسار بصری ۱۱۰ھ، محمد بن سیرین ۱۱۰ھ، طلحہ بن مصرف ۱۱۲ھ، قتادہ ونافع ۱۱۷ھ، محمد بن علی (امام باقر) ۱۱۴ھ، عطاء بن ابی رباح ۱۱۵، عمرو بن مرہ ۱۱۵ھ، ابو صخرہ جامع بن شداد ۱۱۸ھ، قیس بن مسلم ۱۲۰ھ، حماد بن ابی سلیمان استاذِ ابو حنیفہ ۱۲۰ھ، سلمہ بن کہیل ۱۲۱ھ، زبید بن حارث ۱۲۲ھ، ابو اسحٰق سبعی ۱۲۸ھ، یحیٰی بن ابی کثیر ۱۳۹ھ، ابن شبرمہ ۱۴۴ھ، ہشام بن عروہ وعبد الملک بن ابی سلیمان ۱۴۵ھ، اسماعیل بن ابی خالد ۱۴۶ھ، اعمش، محمد بن عبد الرحمٰن، امام جعفر صادق، زکریا بن ابی زائدہ ۱۴۸ھ، ابو حنیفہ وابو جناب کلبی ۱۵۰ھ، علی بن صالح ۱۵۴ھ، مسعر بن کدام ۱۵۵ھ، عمر بن زر ۱۵۶ھ، اسرائیل بن یونس ۱۶۰ھ، قیس بن ربیع وحسن بن صالح ۱۶۷ھ، شریک بن عبد اللہ ۱۶۱ھ، شریک بن عبد اللہ ۱۷۷ھ، زہری ۱۲۴ھ، جعفر بن ایاس ۱۲۳ھ، سعید بن عبد العزیز ۱۶۴ھ، داود طائی ۱۶۵ھ، حماد بن سلمہ ۱۶۵ھ، یحیٰی بن سلمہ ۱۶۸ھ، حبان بن علی ۱۷۱ھ، محمد بن ابان ۱۷۱ھ، سلام بن ابی مطیع ۱۷۳ھ، بکر بن مضر ۱۷۵ھ، ابو عوامہ ۱۷۶ھ، ابراہیم بن حمید، مفضل بن یونس، عبد الوارث بن سعید ۱۷۸ھ، مالک بن انس، خالد بن عبد اللہ، حماد بن زید ۱۷۹ھ، عباد بن عباد، سعید بن خثیم، سلمۃ الاخمر، علی بن ہاشم ۱۸۰ھ، یزید بن زریع ۱۸۱ھ، عبد الاعلیٰ وابن علیہ ۱۸۹ھ، سفیان بن عیینہ، یحیٰی، عبد الرحمٰن ۱۹۸ھ، عمر بن یونس، وہب بن جریر ۲۰۶ھ، ابو عاصم ۲۱۳ھ، محمد بن عبد اللہ انصاری ۲۱۵ھ، بعمر ۹۷ سال یعنی: ۱۱۸ھ میں ولادت ہوئی تھی، اسماعیل بن ابی اویس، احمد بن عبد اللہ بن یونس، ابو الولید طیالسی ۲۱۷ھ، بشر حافی ۲۲۷ھ، ابو نصر تمار ۲۲۸ھ، علی بن جعد، مومل بن فضل، ہارون بن

معروف، عاصم بن علی، محمد بن زیاد اعرابی ۲۳۰ھ، احمد بن نصر خزاعی ۲۳۱ھ، حکم بن موسیٰ ۲۳۲ھ، ابراہیم بن محمد بن عرعرہ، محرز بن عون ۲۳۲ھ، عمرو، ناقد، عبد اللہ بن عون ۲۳۲ھ، یحییٰ بن معین ۲۳۲ھ، قواریری، منصور بن ابی مزاحم ۲۳۵ھ، اسحٰق بن اسماعیل طالقانی ۲۳۰ھ، یحییٰ بن ایوب مقابری ۲۳۴ھ، محمد بن اسحٰق مسیبی ۲۳۶ھ، یحییٰ بن یحییٰ ۲۳۴ھ، عبد الملک بن حبیب ۲۳۸ھ، عبد السلام بن سعید ۲۴۰ھ، ابونور ۲۴۶ھ، حسن بن محمد زعفرانی ۲۶۱ھ، ربیع بن سلیمان مرادی ۲۷۰ھ، یونس بن عبد الاعلی ۲۶۱ھ، امام احمد بن حنبل ۲۴۱ھ، عبد الرحمٰن بن محمد بصری ۲۷۱ھ، حنبل بن اسحاق ۲۷۳ھ، ابراہیم بن ولید، احمد بن عبد الجبار عطاروی، محمد بن عبید اللہ منادی ۲۷۲ھ، حسن بن مکرم، علی بن عبد الحمید ۲۷۴ھ، عبد الکریم دیرعاقولی ۲۷۸ھ، غلام الخلیل ۲۷۵ھ، عبد اللہ بن ابی الدنیا۲۸۲ھ، حارث بن ابی اسامہ ۲۸۲ھ، جعفر طیالسی ۲۸۲ھ، اسحٰق حربی ۲۸۴ھ، ابراہیم حربی ۲۸۵ھ، محمد بن یونس کدیمی ۲۸۶ھ، بشر بن موسیٰ ۲۸۸ھ، معاذ بن المثنیٰ ۲۸۸ھ، عبد اللہ بن احمد بن حنبل ۲۹۰ھ، احمد بن یحییٰ حلوانی ۲۹۶ھ، موسیٰ بن اسحٰق ۲۹۷ھ، صالح بن محمد ۲۹۳ھ، نصر بن احمد ۲۹۳ھ، سہیل بن شاذویہ ۲۹۹ھ، عبد اللہ بن دارہ ۲۹۵، عبد اللہ بن جعفر بن خاقان ۲۹۶ھ، احمد بن عمر ذہلی ۲۹۵ھ، ابوعبد الرحمٰن دہکانی ۲۹۷ھ، ابوصالح حافظ الحدیث ۲۹۹ھ، ابو العباس احمد بن سعید بن مسعود ۲۹۸ھ، محمد بن سری، احمد بن حسین، ابو علی خرقی ۲۹۹ھ، ابو عمر قتات ابن دلاّن، علی بن طیفور، فضل بن صالح ہاشمی، حسین بن عمر اور احمد بن یعقوب ۳۰۰ھ۔

مذکورہ رُواۃِ حدیث اور ان کی وفیات درج کرنے کے بعد اب اس کی ضرورت نہیں رہتی کہ مابعد صدیوں میں پیدا ہونے والے اور حدیثوں کی خدمت کرنے والے

علمائے اعلام کی فہرست پیش کی جائے، کیونکہ اب دور صحاح ستّہ کا شروع ہو چکا تھا اور اس کے بعد حدیثوں کی ساری خدمات براہِ راست یا بالواسطہ انھیں صحاح سے متعلق رہیں اور آج تک جاری ہیں۔ کتبِ حدیث اس قدر شائع ہو چکی ہیں کہ اب ابتدائی تین صدیوں کی طرح راویوں کی چھان بین کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اب دوسرے طریقوں سے سنتِ نبوی کی خدمت ہوتی جاتی ہے۔ چنانچہ حضرت الاستاذ مولانا ظفر الدین صاحب پرنسپل مدرسہ بحر العلوم، بہار کی "جامع الرضوی" کی تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور کچھ زیرِ طبع ہیں اور بعض حصّے ہنوز زیرِ ترتیب ہیں، اسی طرح حضرت الاستاذ مولانا اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق پرنسپل مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ کی تالیف بنام "منزل الثوی" ان کے سامنے طبع ہو چکی تھی، مگر دوسری تالیفاتِ حدیث ہنوز قلمی صورت میں تھیں کہ ان بزرگوار محدث کا انتقال ہو گیا۔

گذشتہ تفصیلات سے ظاہر ہے کہ دینِ مبین میں حدیثوں کی اہمیت کیا ہے اور یہ شرعی حجت کس طرح ہیں۔ صحابۂ کرام کے مبارک عہد سے آج تک حدیثوں کی حفاظت میں زبان و قلم کتنے منہمک رہے، جمع و تالیفِ حدیث میں ایمان کے تقاضے کیوں کر پورے ہوئے، خلفاء، وُلاۃ اور علمائے اسلام نے اپنے فرمان، سعی اور تعلیم کے ذریعے حدیثوں کی روایت واشاعت کے لیے عہد بعہد کیا کیا طریقے اختیار کیے کہ آج اسلامی علوم وفنون میں کتبِ سُنت اور ان کے متعلقات علوم کے ذخیرے دنیا کے دوسرے مضامین کے مقابلے میں بہت زیادہ اور ضخیم ہیں۔

حدیثوں کی حفاظت کی دُھن میں مسلمانوں نے نہ صرف متونِ حدیث کو ضائع ہونے سے بچالیا، بلکہ اس سے دین کے خدمت گذاروں کو بھی حیاتِ جاوید حاصل ہو گئی کہ

عہدِ صحابہ سے آج تک کے راویانِ حدیث کے حالاتِ زندگی سوانح حیات بسط و تفصیل کے ساتھ کتابوں میں درج اور زبانوں پر جاری ہیں۔ سنتِ نبوی علیہ السلام آبِ حیات کا چشمہ ہے، جس سے سیر اب ہونے والا کبھی نہیں مرتا، اس کے قبول واتباع نے کل عرب کے مُردہ دلوں میں روح پھونکی تھی اور آج بھی ان کا فیض عام ہے۔

❀.....❀.....❀.....❀

بابِ دہم

حدیثوں سے استفادے کا طریقہ

۔۔ نقد و انتخاب روایت کے اصول و اسناد

۔۔ حدیثوں کی تحقیق کے قواعد

۔۔ اسناد کے متعلق جرح اور تعدیل کے شعبے

۔۔ متنِ حدیث کی روایتیں

۔۔ حدیث کے الفاظ و معنی سے استفادہ کی شرطیں

جہاں تک حدیثوں کے جمع و تدوین کا کام تھا، چوتھی صدی ہجری تک باقاعدہ جاری رہا اور تمام مرویات کتابوں میں جاری ہو گئیں، راویوں کے حالات کا تتبع اور ان پر جرح وتعدیل کا کام بھی کتبِ حدیث کی تدوین کے ساتھ ہوتا رہا اور قرآن وحدیث کے باہمی رشتہ کا اظہار اور فقہی مسائل کے استنباط کی کوشش بھی انھیں دنوں شروع ہو چکی تھیں اور زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ ان کی طرف نئے نئے انداز سے توجہ کی گئی۔

یہ کہنا غلط ہوگا کہ حدیثوں سے متعلق خدمتِ دین کا کوئی شعبہ مطروح ومتروک رہا اور سلفِ صالحین نے اس کی طرف توجہ نہیں کی، رُواۃ کی چھان بین حدیثوں کا نقد وانتقاد، روایتوں کی تخریج، مسائل کا استنباط، حالات کے تقاضے اور انسانی ضروریات کے مطابق کسی روک ٹوک کے بغیر جاری ہے۔

آج بھی جب کہ تمدن کی ترقی، معاش ومعاشرت کی رنگارنگی سے نئے مسائل پیدا ہو گئے ہیں، قرآن وسنت کی مدد سے تمام مشکلات کا حل دریافت کیا جائے گا اور وہ لوگ جن کے دلوں میں صحیح شمعِ ایمان روشن ہے اور ان کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی نصرت حاصل ہے، دنیا کے سامنے پسندیدہ راہِ حیات پیش کریں گے۔ طاغوت کا اور شیطان کا تسلط جو آج چاروں طرف محیط ہے اور ادھر صدیوں سے اہلِ حق کی آواز سُنی نہیں جاتی، علمائے اسلام کے خلاف معاشی پہرے بٹھائے گئے ہیں اور زندگی کے تمام راستے ان پر بند ہیں، یہ زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکتے، اسلام کو فنا کرنے کی ساری کوششیں آج تک ناکام ہوتی رہیں اور ہدایتِ الٰہی کا یہ چراغ، مخالفت کی شدید آندھیوں میں بھی جھلملائے بغیر ایک طرح جل رہا ہے۔

چودہ سو سال کی اسلامی تاریخ پر نگاہ ڈالیے، اس طویل دور میں نہ جانے کتنے اہلِ قلم، اہلِ زبان اور اہل تیغ پیدا ہوئے، زمانے کے انقلاب نے کتنوں کو اقتدار کی کرسیوں پر

بٹھایا اور خدا معلوم کتنی ہستیاں سریرِ عظمت سے اُٹھا کر نیچے پھینک دی گئیں کہ آج ان کے نام اور کارنامے بھی لوگوں کو یاد نہیں، مگر اس طویل مدت میں دین کے خدمت گزاروں پر نظر کیجئے، تو کوئی عصر اور کوئی عہد ایسا نہیں ہو گا، جس میں خدا پرستوں کا ایک گروہ آفتابِ ہدایت بن کر نہ چمک رہا ہو۔ علمائے اعلام، محدثینِ کرام، صوفیائے عظام کے اسمائے گرامی زمانے کی لوحِ پیشانی پر بخطِ نور لکھے ہوئے نظر آتے ہیں، جنھیں دنیا نہ کل بھلا سکی اور نہ آئندہ فراموش کرنے پر قادر ہے۔

موجودہ دور میں حدیثوں کی زبانی روایت کی ضرورت نہیں، جرح وتعدیل کی طرف سے بھی اطمینان ہے، کیونکہ اسلاف ان شعبوں کو مکمل کر چکے، اب ہمیں ان کے مساعی کا شکر گزار ہونا چاہیے، جرح وتعدیل میں مزید انہماک محض تضییعِ اوقات ہو گا، بلکہ ان کے کارناموں پر اعتماد کر کے اپنی عبدی ضروریات پوری کرنے کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ وہ لوگ جو شکوک میں مبتلا ہیں، یا کسی رکیک جذبے کے ماتحت حدیثوں کے متعلق لوگوں کے اعتقاد کو متزلزل کرنا چاہتے ہیں، اُن پر یہ واضح رہنا چاہیے کہ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ حدیثوں کو مشتبہ ثابت کرنے کے لیے بھی بڑے وسیع علم کی ضرورت ہے۔ جو بدنیتی سے حدیثوں پر جرح اور حجت کرے، اُس کو حسبِ ذیل شعبوں کا علم ہونا بھی ضروری ہے۔

اِسناد سے متعلق جرح وتعدیل کے شعبے

جب تک مندرجہ ذیل باون (۵۲) باتیں اچھی طرح پیش نظر نہ ہوں، کسی کے لیے آسان نہیں ہے کہ حدیثوں کی سند پر باقاعدہ بحث کر سکے اور جرح وتعدیل کی روشنی میں صحیح وضعیف روایتوں میں امتیاز کر لے:

۱۔ عالی اِسناد کی واقفیت،

۲۔ نازل اِسناد کا علم،

۳۔ راوی کی صداقت، ثقاہت، مقررہ اصول کی صحت وخوبی حفظ واتقان، دینداری واحتیاط وغیرہ،

۴۔ مسانید کا علم،

۵۔ موقوف روایتوں کی واقفیت،

۶۔ مرسل روایتیں،

۷۔ صحابہ کرام اور ان کے طبقات ومراتب کی پہچان،

۸۔ صحابۂ کرام کی مرویات جو حضور اکرم علیہ السلام سے روایت ہیں، مگر آنحضرت کا نام پاک مذکور نہیں ہے،

۹۔ منقطع اسناد کی واقفیت،

۱۰۔ مسلسلُ الاسناد روایتوں کی واقفیت،

۱۱۔ معنعن روایتیں،

۱۲۔ معضل روایتیں،

۱۳۔ مدرج کی پہچان، یعنی: حضور علیہ السلام کے کلام میں صحابی کا قول کہاں کہاں ملتا ہے،

۱۴۔ تابعین کو ان کے طبقات ومراتب کے اعتبار سے جاننا،

۱۵۔ اَتباعِ تابعین کی واقفیت،

۱۶۔ بڑے اور چھوٹے راویوں کی پہچان،

۱۷۔ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی اولاد اور صحابۂ کرام کی اولاد کا تفصیلی علم،

۱۸۔ جرح وتعدیل پر عبور، یعنی: فنِ تعدیل کی پانچوں قسمیں اور فنِ جرح کی دسوں انواع کی واقفیت،

۱۹۔ صحیح وسقیم روایتوں کی معرفت اور یہ فنِ جرح وتعدیل کے فن سے علیحدہ ہے،

۲۰۔ فقہِ حدیث کی واقفیت،

۲۱۔ حدیثوں میں ناسخ ومنسوخ کا علم،

۲۲۔ متنِ حدیث میں جو غریب الفاظ آئے ہیں، ان پر کامل عبور ہو،

۲۳۔ مشہور حدیثوں کی واقفیت اور پہچان،

۲۴۔ غریب حدیثوں کی واقفیت،

۲۵۔ مُفرد حدیثوں کی پہچان،

۲۶۔ تابعین واَتباعِ تابعین سے آج تک جو مدلّسین رُواۃ ہیں، ان کی واقفیت،

۲۷۔ عللِ حدیث کی واقفیت، یہ فنِ صحیح وسقیم روایتوں اور جرح وتعدیل سے الگ ہے،

۲۸۔ روایاتِ حدیث میں شاذ روایتوں کی پہچان،

۲۹۔ متعارض ہم پلّہ سُنن کی واقفیت،

۳۰۔ ان روایتوں کی واقفیت جو بہ لفظِ اخبار آئی ہیں اور ان کی معارض کوئی دوسری حدیث نہیں ہے،

۳۱۔ اس کی پہچان کہ کسی راوی نے روایت میں تفسیری وفقہی الفاظ بڑھادیے ہیں،

۳۲۔ راویوں اور محدثین کے مذہب وعقیدہ کا علم،

۳۳۔ حدیثوں کا مذاکرہ اور بحث وتمحیص سے کھرے کھوٹے کی شناخت،

۳۴۔ متن حدیث میں راویوں کی لغزشوں کی واقفیت اس سلسلہ میں کاتبوں کی اصلاح آج بھی شہرت رکھتی ہے،

۳۵۔ ان لغزشوں کی واقفیت جو محدثین سے سند کے بیان کرنے میں ہوئی ہیں،

۳۶۔ صحابہ سے لے کر آج تک راویانِ حدیث کے بھائیوں اور بہنوں کا علم اور ان سب کے حالات ومراتب کی واقفیت،

۳۷۔ صحابہ، تابعین اور تبعِ تابعین میں ان لوگوں کی واقفیت، جن سے روایت ان کے ایک ہی شاگرد کے ذریعہ ملی ہے، خصوصاً صحابۂ کرام کی ایک جماعت ایسی ہے، جن سے صرف ان کی اولاد ہی نے حدیثیں روایت کی ہیں،

۳۸۔ صحابہ، تابعین اور اتباعِ تابعین کے قبائل کی واقفیت اور راویوں کے نسب کا علم

۳۹۔ حدیثوں کے قدیم صحیفوں اور نسخوں کا علم، جو مؤلف کے شاگردوں میں گردش کرتے رہے اور وہ لوگ ان مجموعوں سے روایت کرتے رہے،

۴۰۔ محدثین کے ناموں کی واقفیت، کیونکہ سند میں کبھی توراوی کا نام بیان کیا جاتا ہے اور کبھی ابنیت بتائی جاتی ہے اور کبھی ابّوت وامومت کی نسبت پر اکتفا ہوتا ہے،

۴۱۔ صحابہ، تابعین وتبعِ تابعین کی کنیتوں کی واقفیت،

۴۲۔ راویانِ حدیث کے وطن وشہر کا علم اور ان کے اسفار واقامت گاہوں کی واقفیت،

۴۳۔راویانِ حدیث میں جولوگ موالی ہیں، یاموالی کی اولاد ہیں، ان کی صحیح واقفیت،

۴۴۔۴۵۔ محدثین کے القاب کی واقفیت، کیونکہ بعض رُواۃ نام کنیت کے بجائے اپنے پسندیدہ یاناپسندیدہ لقب سے مشہور رہیں،

۴۶۔ تابعین، اَتباعِ تابعین اور دیگر علمائے اسلام اور راویانِ حدیث کے اقران،

۴۷۔ معاصرین کی واقفیت اور ان کی ایک دوسرے سے روایتِ حدیث، راویوں کے ناموں، کنیتوں، شہروں، خاندانی بستیوں، اور پیشوں میں جو اشتباہ و مماثلت ہے، ان میں امتیاز حاصل ہو اور یہ تشابہ تجنیسِ خطی اور تجنیسِ صوتی دونوں کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور اِعراب و نقاط کے تغیر سے بہت فرق پیدا ہو جاتا ہے، مثلاً بصری، نصری، نفری یا بجلی، بجلی اور نجلی وغیرہ، اس تشابہ کی اور بھی بہت سی صورتیں ہیں، سند کو پرکھنے کے لیے ان سب پر کامل عبور ضروری ہے،

۴۸۔ حضور اکرم علیہ السلام کے مغازی [۹۴]، سرایا اور بُعوث [۹۵] کی واقفیت، ان میں شریک ہونے والوں کا علم، ثابت قدم و غیر ثابت قدم افراد کی پہچان اور جو مصائب و شدائد پیش آئے اور وقتی حالات کے لحاظ سے جو احکام دیے گئے ان کی معرفت،

---

۹۴ **مغازی:** علامہ مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی رحمۃ اللہ علیہ 'بذل القوۃ فی حوادث سنی النبوۃ' میں لکھتے ہیں:
"وہ فوجی مہمات، جن میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس شریک ہوئے، محدثین کی اصطلاح میں انھیں 'مغازی' اور 'غزوات' کہا جاتا ہے"۔
(ملاحظہ ہو: 'سیرتِ سید الانبیاء' اردو ترجمہ: 'بذل القوۃ' از مفتی محمد علیم الدین نقشبندی مجددی رحمۃ اللہ علیہ، ص ۱۴۳)

۹۵ **سَرایا اور بُعوث:** 'بذل القوۃ فی حوادث سنی النبوۃ' میں ہے:
"سرایا اور بُعوث سے مراد وہ فوجی مہمات ہیں، جن میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس شامل نہ ہوئے، بلکہ ان میں صرف صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو روانہ فرمایا۔
'سریّہ' اور 'بَعث' میں لغت کے لحاظ سے فرق ہے: سَریّہ اس چھوٹے لشکر کو کہتے ہیں، جو کم از کم پانچ افراد پر مشتمل ہو، بعض علما فرماتے ہیں کہ کم از کم سو افراد پر مشتمل ہو، تو 'سریّہ' کہلائے گا۔ سریہ کے افراد کی
=

۴۹۔ تابعین و تبعِ تابعین میں مشہور ثقہ راویوں کی واقفیت اور ان کی خدماتِ حدیث کا علم،

۵۰۔ محدثین نے اپنے مجموعوں کو جتنے ابواب میں تقسیم کیا ہے، ان کا علم اور ان کے اسباب ووجوہ کا علم اور جو ابواب ان کے صحیفوں میں اندراج سے رہ گئے ہیں، ان کے وجوہ واسباب کی واقفیت،

۵۱۔ ان تابعی رُواۃ کا علم، جن کی روایتیں صحاح میں درج نہیں ہیں اور ان راویوں کے خلاف بھی کوئی تنقید نہیں ہے،

اور ۵۲۔ محدثین کی راویوں کی واقفیت کہ سماع، کتابت اور عرض کردہ روایتوں میں رد و قبول کی کیا صورتیں ہیں۔

یہ باون (۵۲) اُمور حدیثوں کے نقد و تعدیل کے لیے اُصول کی حیثیت رکھتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کی مختلف ذیلی شاخیں ہیں، ہمارے اسلاف صالحین رحمۃ اللہ علیہم نے ان تمام

=

زیادہ سے زیادہ تعداد چار سو ہوتی ہے اور بعض علما کے نزدیک پانچ سو۔ 'بَعث' وہ فوجی مہم ہوتی ہے، جو لشکر سے کچھ (منتخب) افراد کو الگ کرکے بھیجی جائے"۔

نوٹ: سرایا اور بعوث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے شامل نہ ہونے کی وجہ یوں بیان فرمائی ہے: قسم ہے اس ذات کی! جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے! اگر مسلمانوں پر گراں نہ ہوتا تو میں کسی سریّہ سے، جو راہِ خدا میں جہاد کے لیے نکلتا ہے، پیچھے نہ رہتا لیکن جب (موانع کے باعث) مجھے جانے کی گنجائش نہیں رہتی تو انھیں بھیج دیتا ہوں اور جب (میری روانگی کے بغیر) انھیں چارہ نظر نہیں آتا، تو وہ مجھے روانہ کر دیتے ہیں، پھر میری روانگی کے بعد ان کا پیچھے رہنا ان پر دشوار ہو جاتا ہے۔۔ الخ"۔ (ملاحظہ ہو: 'سیرتِ سید الانبیاء'، ص۱۷۶)

اصولوں اور ان کی ضمنی شاخوں پر علیحدہ علیحدہ ضخیم کتابیں لکھی ہیں اور یہ تمام علمی سرمائے دینِ مبین کے ساتھ اُمتِ مسلمہ کو وراثتاً ملے ہیں۔

خیال فرمایئے کہ عہدِ رسالت کی چوتھی صدی ہجری تک اکابرِ ملت وحاملینِ دین کی یہ ساری کوششیں فضول تو نہ تھیں۔ تاریخ وسیرت ہی پر اگر لکھنا تھا، تو ہر دور میں بڑے وسیع میدان ہیں، جہاں انسان اپنا جوہر دکھا سکتا ہے، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ علماء و محدثین حدیثوں کے جمع وتدوین اور راویوں کی جرح وتعدیل میں مشغول رہے اور تمام ملت ان بزرگوں کی اس سعیِ جمیل کو سراہتی رہی اور اپنے دین ودنیا کی بہتری کے لیے قبول کرتی رہی۔ اگر حدیثوں کی دینی اہمیت نہ ہوتی، تو عوام وخواص ان کے درپے نہ ہوتے۔ غریب راویوں کی سوانح وسیرت سے زیادہ بہتر تھا کہ اہلِ اقتدار کی سوانح لکھتے، ملک کی تمدنی وثقافتی تاریخ لکھی جاتی تو ان حضرات کو زیادہ سے زیادہ دنیاوی فوائد حاصل ہوتے، مگر ان بزرگوں نے حکومت و اہلِ حکومت کی تاریخِ مملکت، نظامِ مملکت کے حالات قلم بند کرنے کے بجائے راویوں کی چھان بین میں اپنی عمریں گزار دیں اور ان کے ہم عصر عوام نے بھی ان کی مشقت وسعی کو سراہا، یہ ایسی باتیں تو نہیں ہیں کہ بہ آسانی ان کو نظر انداز کر دیا جائے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ لوگ حدیثوں پر تنقید نہ کریں اور راوی وروایت پر جرح وتعدیل سے باز رہیں۔ اگر کسی کو اللہ نے صلاحیت اور وقت عطا کیا ہے، تو ضرور اس کام میں دلچسپی لیں۔ مگر جو قدم بھی اس راہ میں اُٹھائیں، محض سطحی علم نہ دنیا میں کارآمد ہے نہ دین میں، جب تک مذکورہ باون اصول اور ان کی ذیلی شاخوں پر عبور نہ ہو اور وہ تمام تصانیف، جو ان اصول سے متعلق اسلاف نے مرتّب کی تھیں، اچھی طرح حافظے میں موجود نہ ہوں، اس وقت تک اس راہ میں کوئی پیش قدمی مفید نہیں ہو گی۔

اسی لیے ہماری گزارش ہے کہ نہ اب وہ پہلا ماحول ہے، جبکہ مدارس میں مواعظ تھے، مساجد میں اور منبروں پر راوی و روایت کا ذکر تھا۔ جرح و تعدیل کے چرچے تھے اور نہ اب ان تمام مذکورہ اصول و ذیول سے متعلق ساری تالیفات پر کسی کو عبور ہی ہے، علاوہ ازیں اگر جرح و تعدیل اور معرفتِ حدیث سے متعلق تصنیفات ہی کی مدد سے کام کرنا ہے، تو اسلاف اس اہم فرض کو پورے طور پر انجام دے چکے ہیں۔ ثقہ و غیر ثقہ راوی، صحیح وضعیف روایت پر تفصیلی بحث کر کے ان کی اچھی طرح وضاحت کر دی ہے، ہمیں چاہیے کہ ان سے استفادہ کریں۔

صحابہ، تابعین اور علمائے محققین کو جرح و تعدیل حدیث کے لیے جو سہولتیں حاصل تھیں، اب بدلے ہوئے حالات میں ممکن نہیں، انھیں کے قول سے یہ بات معلوم کر کے کہ فلاں راویِ حدیث کا حافظہ ضعیف تھا، اس حدیث پر اعتراض کرنا لغو ہے۔

کوئی شخص جو آپ کے نزدیک غیر محتاط یا کمزور حافظے والا ہے، ایک خبر بیان کرتا ہے اور یہی خبر بجنسہٖ دوسروں کی زبانی بھی آپ سنتے ہیں اور بالآخر سچ سمجھ کر آپ قبول کر لیتے ہیں اور واقعے کے لحاظ سے وہ خبر سچی بھی ثابت ہوتی ہے، مگر اس واقعے کے اندراج کے ساتھ اگر آپ خبر رساں کے حالات بھی قلمبند کریں گے، تو آپ اس کی کمزوریوں کا تذکرہ ضرور کریں گے، حالانکہ اس کمزور حافظے والے غیر محتاج راوی کی خبر آپ قبول کر چکے ہیں۔ اس قبول کی وجہ ہم عصری تھی، کیونکہ جس واقعے سے متعلق خبر دی گئی، وہ آپ کے زمانے میں ظاہر ہوا اور ذریعۂ علم اس راویٔ اوّل کے علاوہ دوسرے بھی تھے، جو صرف آپ کو میسّر آئے بعد میں آنے والوں کو یہ سہولتیں حاصل نہیں ہوں گی۔

اسی لیے بعد میں آنے والے کسی حدیث کو ضعیف راوی سے سن کر فوراً رد کر دیں، تو یہ ان کی غلطی ہے، بلکہ ان کو چاہیے کہ وہ وجوہ واسباب معلوم کریں کہ اس ضعیف راوی کے بیان کو کسی مستند محدث نے کیوں قبول کیا؟ اس حدیث کی تائید میں اور دوسرے شواہد وثبوت کیا تھے؟ جب تک تمام کُتبِ حدیث اور ان کے تمام راویوں پر کامل دسترسی نہ ہو، آج ہزار سال پیشتر کے قبول وَرد کے متعلق آخری فیصلہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ دوسری صدی ہجری کی روایتوں میں صحابی تک سند دو ایک راویوں کے ذریعے پہنچ جاتی تھی، لیکن سو دوسو برس بعد پانچ سات کڑیوں کا اضافہ ہوگیا، جس کا اثر سند کے ضعف و قوت پر پڑتا ہے، مثلاً امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو حدیثیں عموماً تابعین سے ملیں، یعنی: صحابی اور امام کے درمیان صرف ایک واسطہ تھا اور اس ایک راوی وسط کے حافظے اور دینداری کا صحیح علم تھا، امام نے روایت قبول کرلی، لیکن یہی روایت اسی سند سے پانچ مزید واسطوں کے بعد چوتھی صدی ہجری کا ایک محدث بیان کرتا ہے، ممکن ہے کہ ان نئے پانچ درمیانی راویوں میں کوئی شخص ضعیف حافظے والا آگیا ہو اور وہ روایت جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو صحیح پہنچی تھی، اس محدث تک پہنچنے میں ضعیف ہوگئی، اس محدث نے راوی کے ضعف کا اقرار کے حدیث کو صحیح قرار دیا، کیونکہ عملی تواتر اور دوسری روایتوں سے اس کی تصدیق حاصل ہوگئی۔ اس لیے اصل روایت تو صحیح تھی، اگرچہ درمیان میں نیچے کا ایک راوی کمزور تھا۔

اس تصدیق وتردید میں ماحول وزمانہ کی جو مدد اگلوں کو حاصل تھی، اب ہمیں حاصل نہیں ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ اگلوں پر اعتماد کریں اور اگر حدثیوں کو پرکھنا چاہیں، تو فنِ حدیث کے تمام اصول وفروع پر عبور حاصل کریں اور کسی وقت کوئی پہلو نگاہ

سے اُوجھل نہ ہونے دیں۔ آج جو دو ایک برگشتہ افراد اسماءُ الرجال سے دو ایک تنقید نقل کرتے رہتے ہیں، یا کتابُ الموضوعات کی دو ایک روایت بیان کر کے تمام حدیثوں کے متعلق مُعاندانہ فیصلہ کرتے ہیں، ان کی مثال اندھوں کے اس گروہ کی ہے، جس نے ہاتھی کے کسی ایک عضو کو ٹٹول کر پورے ہاتھی کی الگ الگ تعریف کی۔

اس سے قطعِ نظر صحیح حدیثوں کے انتخاب اور موضوع روایتوں کی پہچان کے لیے عقل و تجربے کے نزدیک دوسری شرط اور بھی ہے، وہ یہ ہے کہ قلبِ سلیم، نگاہِ مستقیم، اخلاص اور دیانت موجود ہو، حق کی طلب ہو، صداقت ہو، شعور ہو، پھر آپ کے لیے آسان ہو گا کہ صحیح روایتوں کو اختیار کر لیں اور مشتبہ کو چھوڑ دیں۔ کسی کی مجال نہیں ہے، یہ دعویٰ کر سکے کہ سارے ذخائرِ حدیث میں تمام روایتیں موضوع اور جھوٹ ہیں، یا اس معنی میں سب ہی صحیح ہیں کہ راویان اور محدثین نے پہلے ہی صحیح اور غلط کو الگ الگ کر دیا ہے، جو صحیح ہیں، وہ صحیح ہیں، جو غلط ہیں، وہ غلط ہیں۔

اگر حدیثوں کا مطالعہ مخالفت و عناد کے جذبے سے کیا گیا، تو ان حدیثوں سے ہدایت پہنچنا تو کجا، اس جذبے سے قرآن مجید کا مطالعہ بھی نقصان دہ ہے۔ دشمنانِ قرآن کو اللہ کی یہ روشن کتاب بھی منزل تک نہیں پہنچا سکتی بلکہ "یُضِلُّ بِہٖ کَثِیْراً" (یعنی: قرآن سے بہتیرے گمراہ ہو جاتے ہیں) حدیثوں کا مطالعہ بھی معاندانہ ہو گا، تو اس سے بھی گمراہی حاصل ہو گی۔

متنِ حدیث سے استفادے کے طریقے

گزشتہ صفحات میں حدیث کی سند اور اصولِ جرح و تعدیل کی طرف اشارے کئے گئے تھے اور وہ علوم و فنون بتائے گئے تھے، جو سند کے اعتبار سے حدیثوں کی صحت و سقم

جاننے کے لیے ضروری ہیں۔ جب کوئی شخص تمام لوازم و شرائط کو ملحوظ رکھ کر صحیح حدیث کا انتخاب کرنے میں کامیاب ہو گیا، تو پھر متنِ حدیث سے استفادہ و انتفاع کی منزل آتی ہے۔ یہاں پہنچ کر صحیح ہدایت حاصل کرنے کے لیے بھی چند شرطوں کی پابندی ضروری ہے، اگر یہ شرطیں اچھی طرح ذہن میں محفوظ نہیں رہیں گی، تو کوئی طالبِ حق حدیثوں سے صحیح فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

متنِ حدیث کے اقسام

حدیثیں تین قسم کی ہیں: اوّل: قولی یعنی وہ روایتیں جن میں: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کہہ کر امر و نہی سے متعلق حضور ﷺ کے اقوال بیان کیے جاتے ہیں، دوم: وہ حدیثیں، جن میں صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضور ﷺ کے کسی عمل و فعل کا تذکرہ کیا ہے، سوم: وہ روایتیں، جن میں مذکور ہو کہ کسی صحابی نے آنحضرت ﷺ کے سامنے یا آپ کی واقفیت میں کوئی کام کیا اور آپ نے مشاہدہ و علم کے باوجود ان کو منع نہیں فرمایا۔

شروع اسلام سے آج تک تمام مسلمان ان تینوں قسموں کی روایتوں کو قبول کرتے رہے اور ان کے مطابق بھلے بُرے کاموں میں فرق کرتے رہے، پہلی دونوں قسموں کی حجت تو ظاہر ہے، ہاں تیسری قسم کی رد و قبول میں ممکن ہے بعضوں کو لاعلمی کی وجہ سے شبہہ نظر آئے، لیکن جو لوگ آنحضرت علیہ السلام کے منصب سے آگاہ ہیں اور نبوت و رسالت کی ذمہ داریوں کو جانتے ہیں، ان کے نزدیک تیسری قسم کی روایتیں جنھیں تقریری روایت کہتے ہیں، بلا فرق حجت و دلیل ہیں، کیونکہ تبلیغِ دین، فریضۂ رسالت ہے اور کوئی مؤمن اگر اپنی لاعلمی سے ناپسندیدہ افعال کا مرتکب ہو، تو یہ ذمہ داری رسول کی ہوتی ہے کہ وہ بروقت اصلاح کر دیں، اپنے پیرو کے کسی عمل پر نبی کا خاموش رہنا، اس فعل کے صحیح اور جائز ہونے

کی دلیل ہے۔ انبیاء کبھی باطل پر سکوت اختیار نہیں کرسکتے، نہ اپنے ماننے والوں اور جان نثاروں کے حق میں اور نہ غیروں کے حق میں۔

متنِ حدیث کی روایتیں

جس طرح حدیثیں تین طرح کی ہیں، اسی طرح ان کی روایتوں میں بھی بہت فرق اور امتیاز ہے۔ قولی روایتیں جن کو حضور اکرم ﷺ کا قول کہہ کر بیان کرتے ہیں، وہ اپنی اہمیت اور اثر کے لحاظ سے بقیہ دونوں اقسامِ حدیث سے زیادہ ممتاز ہیں، ان کی حیثیت فرمانِ عام اور دینی قانون کی ہے، جس سے سرتابی اور عدول بغاوت اور قانون شکنی ہوگی۔

حضور ﷺ سے متعلق تمام چھوٹی بڑی باتیں تو بہر حال روایت کردی گئیں ہیں، لیکن قولی روایتوں کو عملی و تقریری حدیثوں کے مقابلے میں جو اہمیت حاصل تھی، راویانِ حدیث نے روایتوں میں بھی ان کا پورا پورا لحاظ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ عملی و تقریری حدیثیں تو بالمعنی روایت ہوتی ہیں، لیکن قولی حدیثیں جن کا آغاز "قَالَ رَسُوْلُ اللہ علیہ السلام" سے ہوتا ہے، انتہائی کوشش کی گئی ہے کہ لفظ و معنی دونوں اعتبار سے بجنسہٖ بیان ہوں، کیونکہ قانون کے الفاظ کی اہمیت معنی سے کم نہیں ہیں، اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ عہدِ صحابہ سے آج تک قولی مرویات میں علمائے اعلام وفقہائے عظام معنوی استناد کے ساتھ الفاظ کو بھی دلیل بتاتے آئے ہیں۔ عملی و تقریری حدیثوں میں چونکہ آنحضرت ﷺ کے الفاظ شامل نہ تھے، وہ بالمعنی روایت ہوتی رہیں، ممکن ہے کہ کسی راوی یا فقیہ نے اپنے فتوے یا کسی مسئلے کی تائید میں کسی قولی حدیث کا محض مضمون بیان کردیا ہو، جیسا کہ آج بھی واعظین، خطباء اور فقہاء کا طریقہ ہے، یا عام لوگ حضور علیہ السلام کی حدیث کہہ کر اردو زبان میں صرف اس حدیث کا مضمون بیان کردیتے ہیں، مگر جب باقاعدہ روایتِ حدیث کہہ کر کوئی شخص حضور کا

قول بیان کرتا ہے، تو اس کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ بجنسہٖ حدیث کے الفاظ بھی ادا کرے۔ چنانچہ قولی احادیث کئی جُداگانہ راویوں سے ایک ہی انداز و الفاظ میں مذکور ہوں، تو ہمیں ایسی روایتوں کو بالمعنی و باللفظ دونوں حیثیت سے قبول کرنا چاہیے، متقدمین اسلاف کا طریقہ تھا کہ بالمعنی روایت کی صراحت فرما دیتے تھے، تاکہ تابعین کو "قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہ علیہ السلام" سُن کر روایت باللفظ کا دھوکہ نہ ہو۔ پچھلے صفحات میں ہم بتا چکے ہیں، صحابۂ کرام جماعتیں بنا کر حدیثیں بیان کرتے تھے، اس طریقۂ کار میں بسا اوقات الفاظِ حدیث کے تحفظ کا خیال بہت اہم تھا۔ صحابۂ کرام و تابعین اُولیٰ کے جمع کردہ صحفِ حدیث میں تو بہر حال الفاظ و معانی دونوں آنحضرت علیہ السلام ہی کے ہوتے تھے۔ لہٰذا اسلفِ صالحین معنی کے ساتھ الفاظِ حدیث کو بھی اسی تعین واعتماد کی وجہ سے اپنے لیے دین کی دلیل سمجھتے تھے اور فقہی مسائل کے استنباط میں ان الفاظ سے بھی مدد لیتے تھے۔

حدیثوں کے الفاظ و معانی سے استفادہ کی شرطیں

جب کوئی حدیث آپ کے سامنے آئے تو آپ کا پہلا فرض یہ ہے کہ آپ قرآن مجید سے اس کا مقابلہ کریں۔ یاد رکھیے کہ ہر وہ روایت جو قرآن مجید کی ضِد اور مخالف ہے، حضور علیہ السلام کا قول و فعل نہیں کہلا سکتی، کیونکہ خدا اور رسول نہ تو دو مخالف سمتوں میں ہمیں چلنے کا حکم دیتے ہیں اور نہ دو کشتیوں پر سوار کرا کے تباہ کرتے ہیں۔

حدیثیں قرآن مجید کے اجمالی احکام کی شرح ہیں، یا ان کے لیے تتمہ و بیان ہیں اور ان حدیثوں پر قرآن کے ساتھ عمل ممکن ہے، لہٰذا متنِ حدیث سے استفادہ کے لیے مندرجہ اُمور ضروری ہیں:

اوّل قرآن مجید کی ضد و مخالف نہ ہوں۔

دوم مسلماتِ اہل اسلام کے خلاف نہ ہوں، یہ دوسری شرط جس طرح حدیثوں کے معنوی اعتبار کے لیے اہم ہے، اسی طرح قرآن مجید کے فہم معنی کے لیے بھی ضروری ہے۔ مثلاً کسی کو اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ قرآن مجید کا مفہوم دینی مسلمات کے خلاف اپنی رائے سے اختیار کرے اور یہ کہے کہ "كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ [96]۔" (یعنی: تم بے جان تھے اللہ نے تمھیں حیات بخشی، پھر تم کو موت دے گا، اس کے بعد پھر تم کو زندگی عطا کرے گا) سے آواگون اور پھر تناسخ ثابت ہوتا ہے، یا اسی طرح یوم القیامۃ کے معنی حشر کا دن نہیں، بلکہ اُٹھ کھڑے ہونے کا روز مراد ہے۔ یہ معانی چونکہ مسلماتِ اسلام کے خلاف ہیں، اس لیے ناقابلِ قبول اور مردود ہونگے۔ قرآن کے معانی اسلامی اصطلاح اور مسلماتِ دین کے مطابق ہی لیے جائیں گے اور یہ مسلماتِ دین احادیث ہی سے ثابت ہیں۔

ایک گمراہی کی اِصلاح

آج کل کچھ لوگ دین سے نکل کر اندھادھند حصارِ شریعت پر گولہ باری کر رہے ہیں اور وہ تمام حدود و قیود جو اسلام اور پیغمبر اسلام علیہ السلام نے قائم کی ہیں، آج دشمنانِ ملّت کا نشانہ بنی ہوئی ہیں۔ ذرا غور فرمایئے کہ احکامِ اسلامی میں نماز کا مرتبہ کتنا بلند اور روشن ہے۔ نفاذ کے لحاظ سے بھی یہ پہلا فرض ہے اور قیامت میں سوال کے اعتبار سے پہلی پُرسش نماز کے متعلق ہوگی۔ ہر ملت کے لیے ایک جماعتی نشان اور قومی علامت ہوتی ہے۔ اسلام میں نماز کو وہی مقام حاصل ہے، جس شخص کا اسلام سے جتنا تعلق ہوگا، اس روحانی و دینی علامت میں بھی اسی تناسب سے اس کا حصّہ ہوگا۔

---

[96] البقرۃ ۲: (۲۸)۔

مسلمان کی یہ دینی ومذہبی پہچان زنّار وصلیب جیسی نہیں ہے اور نہ برس چھ مہینے میں اس علامتِ دین کا اظہار ہوا کرتا ہے، بلکہ روزانہ پکار پکار کر پیروانِ اسلام کو ایک جگہ اکٹھا کر کے صبح وشام پانچ بار اس علامت کا مظاہرہ کیا جاتا ہے اور یہ طریقہ نیا نہیں، بلکہ اسلام کے ابتدائی دور سے رائج ہے، آنحضرت ﷺ ہی کے حکم سے اذان دی جاتی تھی، لوگ روزانہ مسجد میں جمع ہوتے تھے اور باجماعت نماز ادا کرتے تھے۔ ایک ایسی عبادت جس کی پابندی آج چودہ سو سال سے ہوتی چلی آرہی ہے، کیا اس میں کسی کو اس کی گنجائش ہوسکتی ہے کہ اپنی طرف سے کوئی اپج پیدا کرے۔۔۔!

دن رات میں پانچ فرض نمازیں رسول علیہ السلام کے وقت سے آج تک قائم اور نافذ ہیں، مکّہ کا مینارہ اور مدینہ کی اذان گاہ شاہد ہیں کہ اس طویل مدت میں غلامانِ محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام دن رات میں پانچ بار جمع ہو کر پانچ فرض نمازیں روزانہ ادا کرتے آئے ہیں۔

اس لیے پانچ نمازیں مسلماتِ دین میں سے ہیں اور اس وقت سے آج تک مسلمانوں کے تمام فرقے اور گروہ اس کا اقرار کرتے ہیں، لہٰذا اگر کوئی شخص قرآن مجید کے معنی اس کے خلاف بیان کرے گا، تو لاریب مردود ہوگا، کیونکہ قرآن مجید کی کسی آیت کا کوئی مفہوم مسلماتِ دین کے خلاف نہیں لیا جاسکتا۔ یہی حال حدیثوں کے مفہوم کا بھی ہے کہ ان کے معنی کبھی مسلماتِ دین کے خلاف معتبر نہیں ہوں گے۔ نماز کے فروع اور تفصیلات کو پیش کر کے اگر کوئی شخص گمراہ کرنا چاہے، تو یہ اس کی بڑی نادانی ہوگی۔ نماز کی تفصیلات میں دو طرح کے اعمال ہیں، ایک قسم وہ ہے، جن کی حیثیت مسلماتِ دین کی ہے۔ تمام مسلمانوں اور ان کی مختلف جماعتوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں، مثلاً قیام، قعود، رکوع، سجود یہ چاروں اُمور ارکانِ نماز ہیں اور مسلماتِ اسلام ہیں، ان میں کوئی تغیر

و تبدل نہیں ہو سکتا۔ ان کے علاوہ جو کچھ تفصیلی فروع ایسے ہیں، جن میں باہم فرق و امتیاز ہے، تو اگرچہ وہ سب حضور علیہ السلام سے ثابت ہیں، مگر ان کی حیثیت مسلماتِ دین کی نہیں ہے، شارع علیہ السلام نے ان جداگانہ طریقوں کو اختیار کر کے ہمیں بتادیا کہ نماز کے اندر کن اعمال کو مسلماتِ دین کا مقام حاصل ہے اور کون سے اعمال فروعی ہیں، جن میں انسان کسی ایک کو اختیار کر کے صحیح نماز ادا کر سکتا ہے، تاکہ ہماری غلامی اور آزادی کا مظاہرہ ساتھ ساتھ ہو۔ حضور اکرم علیہ السلام سے ثابت شدہ ہر طریقہ اپنے اندر ایک نور رکھتا ہے اور اس میں ایک خاص ہدایت ہے۔ اپنے دینی مزاج کے مطابق ان مختلف روحانی نسخوں میں سے کسی کو اختیار کر کے کمالات روحانی حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

متنِ حدیث کی تیسری شرط

حدیثوں سے صحیح استفادہ کے لیے ضروری ہے کہ ہم جان سکیں کہ راوی اگر کوئی خاص عقیدہ و خیال رکھتا ہے اور اپنی اس روایت میں اسی عقیدہ کی تائید پیش کر رہا ہے، تو جب تک اس روایت کی تائید کسی اور ذریعے سے نہ ہو، تو محض اس تنہا بیان کی بنا پر جماعتی رائے اور فیصلے کو مشکوک نہیں کر سکتے، مثلاً حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مخالفت اور ان کو بُرا کہنا خارجی عقیدے کا جزو ہے، اگر کسی خارجی کی روایت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف سامنے آئے، تو ہمیں ان روایتوں کے قبول کرنے سے پہلے ان بیانات کے تائیدی شواہد کی جستجو کرنی چاہیے، کیونکہ علی رضی اللہ عنہ کو بُرا کہنا جماعتِ مسلمین سے الگ راہ روی ہے۔ ایسے متونِ حدیث اگر صحیح ثابت ہوں تو ان کے معنی وہی مراد لیے جائیں گے، جو دوسری روایتوں کے موافق اور جماعتِ مسلمین کی رائے کے مطابق ہوں۔

متنِ حدیث کی چوتھی شرط

اکثر محدثین بعض اوقات کسی طویل حدیث کا وہ حصّہ بیان کرتے ہیں، جو خاص موقع و محل کے مناسب ہوتا ہے، یا بطورِ اشارہ حدیث کے دو ایک جملے روایت کر دیتے ہیں، تاکہ پوری حدیث کی طرف رجوع کیا جائے، لہٰذا متنِ حدیث سے استفادے کے لیے ضروری ہے کہ پوری حدیث سامنے رکھی جائے ورنہ بعض اوقات سخت غلطی کا امکان ہے۔

متنِ حدیث کی پانچویں شرط

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن مجید کلامِ خدا ہے اور حدیثیں بشرِ کامل کا کلام ہیں، اور دونوں عربی زبان میں ہیں، جب سادہ اور سلیس الٰہی کلام کو سمجھنے کے لیے عربی لغت، اسلامی اصطلاح اور حدیثوں کی استعانت ضروری ہے، جیسا کہ پہلے ہم بتا چکے ہیں، تو پھر حدیثوں کو سمجھنے کے لیے بھی عربی زبان دانی، اسلامی اصطلاح، دوسری حدیثوں، قرآن مجید کی آیتوں اور صحابۂ کرام کے آثار کی زیادہ ضرورت ہے۔ روایت باللفظ میں تو حضور علیہ السلام کے کلمات ہوتے ہیں، مگر روایت بالمعنیٰ میں صحابۂ کرام کے الفاظ ہیں اور یہ تمام حضرات بہر حال طرزِ ادا اور قوتِ بیان میں ایک دوسرے کے مقابلے میں کم و بیش ضرور ہیں۔ اس لیے متنِ حدیث سے استفادہ اور ان کے رَد و قبول کے لیے عربی زبان قرونِ اولیٰ کے دینی ماحول کی واقفیت زیادہ سے زیادہ ہونی چاہیے۔

متنِ حدیث سے کامل استفادہ کی چھٹی شرط

مسائل کے استنباط کا ملکہ ہو اور فقاہت کے تمام اصول و ضوابط ازبر ہوں، تاکہ جب کوئی متنِ حدیث سامنے آئے تو انسان اس کی روشنی میں اپنی دینی و دنیاوی مشکلات کا

حل معلوم کر سکے اور اس حدیث سے جو اثرات مرتب ہوتے ہیں، اُن کی طرف سے ذہن غافل نہ ہو۔

اگر مضمون کی طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا، تو مسائل کے استنباط کے لیے پہلی صدی ہجری سے چوتھی صدی ہجری تک یا مابعد زمانوں میں علمائے اعلام اور مجتہدین نے جو قواعد وضوابط بیان کیے ہیں، ان کو یہاں دُہرا دیا جاتا۔ لیکن سلف صالحین رحمۃ اللہ علیہم کی یہ ساری کوششیں اللہ کے یہاں مقبول اور اُمتِ مسلمہ کے نزدیک پسندیدہ ومستحسن ہیں اور بحمد اللہ اس سلسلے میں ان بزرگوں کے کتابی ذخیرے امصار ودیار میں علماء کے پاس موجود ہیں۔ جو صاحب چاہیں، دین کے ان خادموں اور اسلاف کے باقیات الصالحات کی طرف رجوع کریں اور تفصیلی معلومات حاصل کرلیں۔ اُصولِ فقہ بطور خود علومِ اسلامیہ کا ایک مستقل شعبہ ہے اور اس فن میں بڑی ضخیم کتابیں ہزاروں کی تعداد میں آج بھی پائی جاتی ہیں۔ ان تمام کتابوں کی واحد غرض صرف یہ ہے کہ دین کی حجت اور دلیل، قرآن وحدیث ہیں۔ یہی دو بنیادیں حضور علیہ السلام نے صحابۂ کرام کو عطا کیں اور صحابہ نے اُمت کو تعلیم دی اس لیے ان دونوں کی مدد سے ہم کس طرح اپنے دینی ودنیاوی فلاح ونجات کے راستے اختیار کرسکتے ہیں۔ «مَنْ يُّرِدِ اللهُ بِهِ خَيْراً يُفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ»[97]، یعنی: جب اللہ کسی کی بہتری کا ارادہ کرتا ہے، تو اسے دین کی فقاہت عطا کرتا ہے۔

❋ ..... ❋ ..... ❋ ..... ❋

---

[97] ملاحظہ ہو: ’صحیح البخاری‘، ج۱، ص۲۴، و صحیح مسلم، ج۲، ص۷۱۹، رقم: ۱۰۳۷۔

بابِ یازدہم
”احادیث سے استفادہ کے متعلّق دیگر اہم اُمور“

۔۔ مقامِ رسالت

۔۔ توحید ورسالت کی اسلامی فہم

۔۔ قرآن اور حدیث کا باہم ربط

۔۔ قرآن کی تفسیر کے طریقے

۔۔ حدیث کی اصلاح اور قرآن

مقامِ رسالت

دین میں حدیثوں کا مقام اور سنت کا مرتبہ سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ہم رسالت کے منصب و مقام کو سمجھ لیں اور اللہ جل وعلیٰ نے اپنے رسول علیہ السلام کی جو حیثیت بتائی ہے، اس کو تسلیم کریں۔ جب تک منصبِ رسالت کی اہمیت واضح نہ ہو جائے، حدیثوں کا صحیح مقام سمجھ میں نہیں آئے گا۔

رسول کی حیثیت کیا ہے اور ہمارے جیسے ایک بشر کو یہ بزرگی کیوں حاصل ہو گئی کہ ہر غیر نبی ان کے تمام قول و فعل اور امر و نہی کے قبول واتباع کا پابند ہے۔ یہی وہ مسئلہ ہے جس کی صحیح واقفیت کا نام 'اسلام' ہے، ورنہ رسول کی صرف بشری حیثیت پر صَرفِ نظر سے گمراہی پیدا ہوتی ہے اور بالآخر اپنے جیسے انسان کی عظمت کا انکار کر کے انسان کافر و بے دین ہو جاتا ہے۔

لہٰذا رسول کا مقام و منصب معلوم کرنے سے پہلے ہمیں چاہیے کہ اس تھوڑی بہت عقل کی مدد سے جو اللہ نے ہر انسان کو عطا کی ہے، خود اللہ کو پہچانیں اور اس کی عظمت و کبریائی کا اقرار کریں کیونکہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں اُلوہیت و رسالت کا اقرار اس طرح باہم پیوستہ و متلازم ہیں کہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔

اللہ کا اقرار

ہمارا خطاب مسلمانوں سے ہے، جو اللہ، اس کے تمام صفات اور حقوق پر ایمان رکھنے کے مدعی ہیں۔ قرآن مجید کو کلامِ الٰہی تسلیم کرتے ہیں۔ اس لیے ان کو عقلی دلائل اور سائنس کے شواہد کی کوئی ضرورت نہیں ہے، صرف اس قدر یاد دلا دینا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کا خالق ہے، رب ہے، موت و حیات اسی کے قبضے میں ہیں، نفع و نقصان کا اختیار اسی

کو ہے اور وہی ہمارا مالک ہے، بادشاہ ہے اور حقیقی حاکم ہے، ہم سب اللہ کی مملکت میں بستے ہیں، اسی لیے اسی کی اطاعت ہم پر فرض ہے، نہ کسی اور کو حاکم بناسکتے ہیں اور نہ اُس کے حکموں کی بجا آوری میں پس و پیش کرسکتے ہیں، کیونکہ ایسی ہر حرکت بغاوت و سرکشی کہلائے گی۔ اور جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی ساری مملکت کے لیے احکام و قواعد مقرر کر دیے اور ان کے نفاذ کا اعلان کر دیا، تو اب کسی کو ان قوانین کے خلاف لب کشائی کی گنجائش نہیں رہی، قرآن مجید مملکتِ الٰہی کا دستور ہے، آئین ہے، قانون ہے اور ضابطہ ہے، ان قوانین کو لانے والے پڑھ کر سنانے والے تمام دفعات کو سمجھانے والے اور نافذ کرنے والے اللہ کے رسول ہیں۔

"يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ"[۹۸]

یعنی: اللہ کے رسول علیہ السلام اس کے احکام لوگوں کو پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کو نافذ کر کے لوگوں کی اصلاح کرتے ہیں اور اس دستوری کتاب کی تمام دفعات لوگوں کو سمجھاتے ہیں۔

اللہ کی اس دستوری کتاب میں رسول کا مقام و منصب جو کچھ درج ہو گا، مملکتِ الٰہی کے ہر باشندے پر فرض ہے کہ اس کے مطابق رسول کا مرتبہ تسلیم کرے، قرآن کے بتائے ہوئے آئین کی مخالفت اور رسول علیہ السلام کے دستوری حق کا انکار دراصل اللہ سے بغاوت ہے۔

۹۸؎ آلِ عمران ۳: (۱۶۴)۔

رسول علیہ السلام کا مقام قرآن میں

حاکمِ حقیقی تو اللہ ہے، لیکن یہی حق اگر اس نے رسول کی طرف منتقل کر دیا اور اپنے دستور میں رسول کو حاکم بنا دیا ہے، تو اب رسول کے ہر حکم کی بجا آوری ہمارا فرض ہے اور یہ ذمہ داری رسول کی ہو گی کہ وہ خدا کے حکموں کے مطابق ہم پر حکومت کریں، کوئی بات اپنی خواہش سے نہ کہیں اور اپنے عہدے کا ناجائز فائدہ نہ اٹھائیں۔ رسول کا کوئی فرمان معاذ اللہ اگر خود ساختہ ہے، تو یہ معاملہ اللہ اور اس کے مقرر کردہ حاکم کا درمیانی مسئلہ ہے، افسر مجاز جب تک اپنے منصب سے معزول نہ ہو، عوام پر اس کی اِطاعت فرض ہے۔

رہی یہ بات کہ آیا رسول علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق ہم پر حکومت کرتے ہیں، یا اپنے عہدے کو معاذ اللہ من مانی برتری کا ذریعہ بناتے ہیں اور جو کچھ اپنے دل میں آتا ہے لوگوں کا حکم دیتے ہیں، تو اللہ جلّ وعلا نے اس کی طرف سے ہمیں مطمئن کر دیا:

" وَ مَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی "[99] (رسول علیہ السلام اپنے دل سے کچھ نہیں فرماتے، ان کے تمام فرامین میں وحی والہام ہیں)۔

رسول حاکم علی الخلق کی حیثیت سے

آنحضرت علیہ السلام کی حیثیت صرف ایلچی اور پیغام رساں کی نہیں ہے، بلکہ اللہ کی طرف سے ہم پر حاکم بنا کر بھیجے گئے ہیں اور جس طرح ہر محکوم کا فرض ہے کہ حاکم کا ہر حکم بجالائے اور اس کے کسی حکم کی مخالفت نہ کرے۔ اللہ کا فرماں بردار بندہ بننے کے لیے ہم پر ضروری ہے کہ رسول علیہ السلام کے تمام احکام کو قبول کریں، ان کو بجالائیں سرِ مو گردن کشی نہ کریں۔

۹۹۔ النجم ۵۳: (۴)۔

”فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ“[100] یعنی: جو لوگ رسول کے حکموں کو نہیں مانتے ان کو ڈرنا چاہیے کہ اس مخالفت کی سزا میں عذاب الیم یا کسی اور مصیبت میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

عذاب دینے کا اختیار اللہ کو ہے، مگر امر و نہی اور حلال و حرام کے نفاذ کا حق رسول کو بھی حاصل ہے۔

”يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ“[101] (یعنی: رسول علیہ السلام نیک کام کا حکم دیتے ہیں، بُرے کاموں سے منع کرتے ہیں، پاکیزہ چیزیں حلال کرتے ہیں اور گندی چیزیں حرام کرتے ہیں)۔

رسول کے ان اختیارات کی واقفیت کے بعد کسی مسلمان کو جرأت ہو گی کہ رسول علیہ السلام کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال سمجھے اور یہ کہے کہ حرام چیزوں کی یہ فہرست قرآن مجید میں نہیں ہے، بلکہ حدیثوں میں ہے، اس لیے ہم نہیں مانتے اور کتا، بلّی، چوہا، گیدڑ اور سانپ وغیرہ کو اپنے دستر خوان کی زینت بنائے، بلکہ اللہ کے فرمان کے مطابق ایک مؤمن کا عقیدہ یہ ہونا چاہیے کہ

”مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَ مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا“[102] (یعنی: رسول جو دیں لے لو اور جس سے منع کریں، رک جاؤ)

---

[100] النور ۲۴: (۶۳)۔

[101] الاعراف ۷: (۱۵۷)۔

[102] الحشر ۵۹: (۷)۔

ہم کون پوچھنے والے کہ رسول کا یہ حکم اپنے دل سے ہے، یا خدا کی وحی کے مطابق ہے! ہم تو رسول کی فرمانبرداری کے پابند ہیں، کیونکہ ان کی اطاعت اللہ کے قانون کی اطاعت ہے:

''مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ''[103] (جو رسول اللہ کے اطاعت کرتا ہے، وہ اصل میں اللہ کا فرمانبردار ہے)۔

اور جب تک رسول کی حاکمیت بے چون وچرا تسلیم نہیں کی جائے گی، ایمان کا دعویٰ سراسر منافقت اور فریب ہے:

''فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا''[104] (یعنی: ہرگز نہیں ربِ اعلیٰ کی قسم! ہرگز نہیں وہ لوگ مؤمن نہیں ہوسکتے، جب تک اپنے معاملات میں آپکو اے رسول! اپنا حاکم نہ سمجھیں تمھارے فیصلوں کو بہ دل وجان تسلیم نہ کریں اور ان فیصلوں سے ان کے دلوں کو کوئی تنگی پیدا نہ ہو)۔

گویا رسول علیہ السلام کو کمالِ حکومت حاصل ہے اور آپ کا ہر فیصلہ حرفِ آخر ہے، جس کی کوئی اپیل نہیں۔ کیا اس آیتِ قرانی کے بعد کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ حدیثیں ڈیڑھ ہزار برس پہلے عربی تمدن کی یادگار ہیں اور دورِ حاضر میں رسول اللہ ﷺ کے فیصلے کی پابندی ہم پر نہیں۔۔۔!

---

[103] النساء ۴: (۸۰)۔

[104] النساء ۴: (۶۵)۔

ہمارے تمام مسائلِ زندگی میں فیصلے کا حق صرف اللہ کو اور اس کے رسول کو ہے۔جو لوگ ایمان کا اقرار کرنے کے بعد اللہ اور اس کے رسول کی حاکمیت سے منہ موڑتے ہیں، وہ مؤمن نہیں ہیں:

"وَ اِذَا دُعُوۡۤا اِلَی اللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ لِیَحۡکُمَ بَیۡنَہُمۡ اِذَا فَرِیۡقٌ مِّنۡہُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ"[105] (یعنی: جب لوگوں کو بلایا جاتا ہے کہ اللہ اور رسول کی طرف آؤ تا کہ ان کے معاملات کے فیصلے اللہ کے حکموں اور رسول کے حکموں (کتاب وسنت) کے مطابق ہوں، تو یہ منافقین منہ پھیر لیتے ہیں)

اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت

اللہ کی فرماں برداری فرض ہے، کیونکہ مخلوق ہیں اور اس کی رعایا ہیں، اللہ کے حکموں کے مجموعے کا نام 'قرآن' ہے اور ہم پر رسول علیہ السلام کی اطاعت بھی لازم ہے، کیونکہ حاکمِ حقیقی اللہ جل وعلیٰ کا یہی حکم ہے اور رسول کے احکام کے مجموعے کا نام 'حدیث' ہے:

قُلۡ اَطِیۡعُوااللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ فَاِنۡ تَوَلَّوۡ فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الۡکَافِرِیۡنَ[106] "آپ کہہ دیجیے کہ اللہ کی اطاعت کرو (قرآن کی) اور سول کی اطاعت کرو (حدیث کی) پھر بھی اگر وہ لوگ پیٹھ پھیریں، تو بے شک اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا"۔

۱۰۵؎ النور ۲۴: (۴۸)۔

۱۰۶؎ آلِ عمران ۳: (۳۲)۔

قرآن وحدیث کا باہم تعلق

قرآن کلامِ خدا ہے، اسی میں وہ تمام بنیادی قوانین درج ہیں، جو مالکِ حقیقی نے اپنی رعایا کو دیے ہیں۔ لیکن کتابِ آئین اور مجموعۂ دستور کا جو مطلب ہم سمجھیں گے، وہ معتبر ہے یا اس کا مفہوم متعین کرنا رسول کا حق ہے؟ جہاں تک قران مجید کا اپنا اسلوبِ بیان ہے، وہ تو وہی ہے، جو عام عربی زبان کا طرز تھا۔ لیکن قوانین کے دفعات کی تشریح ہمیشہ قانون ساز کے ذمہ ہوتی ہے، ورنہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ قانونی موشگافی کرنے والے الفاظ کا مفہوم کچھ کا کچھ بنادیتے ہیں۔ چنانچہ قران مجید اگرچہ عربی زبان میں ہے، مگر اس کی تشریح کے لیے رسول علیہ السلام کی زبان مبارک کی قید لگادی ہے، قرآن آسان ہے، مگر رسول کی زبان کی مدد سے آسان ہے، کتاب اللہ کا سمجھنا اور اس پر عمل کرنا بہت سہل، مگر یہ سہولت رسول اللہ کی حدیثوں اور ان کے عملوں سے ظاہر ہوتی ہے:

"فَاِنَّمَا یَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ"[۱۰۷] (یعنی: ہم نے قرآن کو آپ کی زبان سے آسان کیا ہے، تاکہ لوگ نصیحت وہدایت حاصل کریں)

اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن کو آسان بنانے کا اعلان تلاوت و قراءت کے لحاظ سے نہیں ہے اور نہ عربی الفاظ کے لغوی معنی کے لحاظ سے، یہ دونوں باتیں تو ہر عرب اور عربی خواں کے لیے آسان ہیں۔ اس میں حضور علیہ السلام کی زبان کو کیا خصوصیت ہے، بلکہ قرآن کی یہ سہولت فہمِ قرآن اور معانی و مطالب کے اعتبار سے ہے اور اس حیثیت سے جو آنحضرت کو اہمیت حاصل ہے، وہ محتاج بیان نہیں اللہ کا ارشاد ہے:

---

۱۰۷ الدخان ۴۴: (۵۸)۔

''وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ''[108] (یعنی: ہم آنے آپ کی طرف ذکر (قرآن) اُتارا، تاکہ آپ وضاحت سے بیان کر دیں لوگوں کے سامنے وہ تمام باتیں جو ان کے لیے اتاری گئی ہیں)

چونکہ قرآن مجید قانون ودستور کی کتاب ہے اور اس کے بیان ووضاحت کے لیے کسی معتبر شارح کی ضرورت تھی۔ اللہ جل شانہ نے تلاوت و تعلیم قرآن کے ساتھ ساتھ اس کے بیان ووضاحت کے لیے لسانِ پیغمبر کو مخصوص کر دیا۔ لہٰذا حضور علیہ السلام بطور خود بھی قرآن مجید کی شرح فرماتے تھے اور جہاں مفہوم کے تعیین میں اختلاف کا اندیشہ ہوتا، تو منصبِ نبوت کی ذمہ داریاں زیادہ ہو جاتیں۔

''وَ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ''[109] (یعنی: ہم نے آپ پر کتاب اس لیے نازل فرمائی تاکہ آپ وہ باتیں لوگوں پر واضح کر دیں، جن میں یہ اختلاف کرتے ہیں)

آپ کے بیانات اور وضاحتیں قرآن کے علاوہ ہوں گی اور ان ہی کو 'حدیث' کہتے ہیں۔

قرآن کی وضاحت کے طریقے

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قرآن مجید کی وضاحت کا کیا طریقہ اختیار کیا؟ جن احکامی آیتوں کو سمجھنے میں کوئی دشواری ہو سکتی تھی، آپ نے ان آیتوں کو دوبارہ بلند آواز سے پڑھ کر سُنا دیا اور اپنی طرف سے کوئی مطالب بیان نہیں کیے، جیسا کہ بعض معلمین بچوں کو فارسی اشعار پڑھایا کرتے ہیں، اگر منکرینِ حدیث توضیحِ آیات

۱۰۸؎ النحل ۱۶: (۴۴)۔

۱۰۹؎ النحل ۱۶: (۶۴)۔

و تبیینِ کتاب سے یہی مراد لیتے ہیں، تو بخدا رسول علیہ السلام کو انھوں نے نہیں پہچانا اور اللہ کے مقرر کردہ حاکم کی قدر نہ کی۔ آنحضرت علیہ السلام نے قرآن مجید کے مطالب دو طرح ہمیں بتائے، ایک تو اپنے مبارک الفاظ سے اور دوسرے اپنے پسندیدہ اعمال سے تشریح کی۔ پہلی قسم کو 'قولی حدیث' کہتے ہیں اور دوسری قسم کی وضاحت کا نام 'فعلی حدیث' ہے اور اللہ تعالیٰ نے دو جدا گانہ الفاظ میں ان دونوں قسم کی حدیثوں پر عمل کرنے کا حکم دیا ہے۔

قولی حدیثوں کی تعمیل یعنی حضور علیہ السلام کے زبانی فرامین کے لیے قرآن مجید میں 'اِطاعت' کا لفظ آیا ہے اور جس طرح اللہ کے کلام، یعنی: قرآن مجید کی اِطاعت فرض ہے، اسی طرح رسول علیہ السلام کے اقوال کو قبول کرنا اور ان کے مطابق عمل پیرا ہونا فرض ہے۔

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ [۱۱۰] یعنی: اللہ کے حکموں پر چلو اور رسول کے فرمان پر عمل کرو۔

فعلی حدیثوں کے لیے 'اِتباع' کا لفظ قرآن میں ہے، یعنی: رسول کے پیچھے پیچھے چلو اور ان کی پیروی کرو، ان کی حرکت کی مطابق حرکت اور ان کے سکون کے مطابق سکون ہونا چاہیے، فَاتَّبِعُوْہُ وَاتَّقُوْہُ [۱۱۱] یعنی: آنحضرت علیہ السلام کے نقش قدم پر چلو اور اِدھر اُدھر منحرف ہونے میں اللہ سے ڈرو۔

غرض رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام صرف پیغام رساں اور نامہ بر نہیں ہیں، بلکہ اللہ کی طرف سے ہم پر حاکم ہیں، ان کا ہر قول 'حکم' ہے اور ان کا ہر فعل 'ہدایت' ہے۔

---

۱۱۰ النساء ۴: (۵۹)۔

۱۱۱ الانعام ٦: (۱۵۵)۔

رسول اللہ کی ساری زندگی دین کی سند ہے اور اللہ کی طرف سے ہمارے لیے نمونہ ہے، دنیا بدلے، دنیا کا تمدّن بدلے، حالات وسیاست بدلیں۔ ماضی، حال، مستقبل ہر زمانے میں بندوں کے لیے یہی پاک نمونہ مینارِ ہدایت اور ابدی سند رہے گا، ترقی وتمدن کی آڑ لے کر حدیثوں سے منہ پھیرنے والے ذرا دوبارہ پھر غور کرلیں:

"لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ لِّمَنْ کَانَ یَرْجُوا اللّٰہَ وَ الْیَوْمَ الْاٰخِرَ"[۱۲۱] یعنی: "تمھارے لیے رسول کی ذات میں بہترین نمونہ ہے، اس کے حق میں جو اللہ کی رحمت کا اُمیدوار ہے اور قیامت کا منتظر ہے"۔

گویا اب قیامت تک صحیح اُمید کا ذریعہ صرف رسول اللہ کی ذات ہے کسی اور نبی کی بھی اُمید نہیں۔ رسول علیہ السلام کی ذات قرآن کا نام تو نہیں ہے، قرآن کے مطابق ہے مگر قرآن سے الگ اور اسی ذات پاک سے متعلق روایتوں کا نام مجموعۂ حدیث ہے۔

حدیث کی اصطلاح اور قرآن

آنحضرت علیہ الصلوٰۃ السلام کی مرویات کو 'حدیث' کہتے ہیں یہ اسلامی اور دینی اصطلاح ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دین کا عظیم الشان رکن قرآن مجید کا تتمہ وبیان خدا کی وحی کے مطابق قرآن کی نبوی تفسیر کے لیے یہ اصطلاحی نام کس نے تجویز کیا، آج کے مُلّاؤں نے، عجمی تابعین نے، صحابہ نے یا رسول علیہ السلام نے؟ اگر یہ اصطلاحی نام حدیثوں سے ثابت ہے، توجب تک حدیثوں کی اہمیت کا اقرار نہ ہو، اس اصطلاح کے قبول پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، اس کا نام 'اُسوہ' کیوں نہیں رکھا گیا، جو قرآن کا لفظ ہے! اس کو 'بیان' کیوں نہیں کہتے کہ یہ بھی

۱۲۱؎ الاحزاب ۳۳: (۲۱)۔

قرآنی اصطلاح ہوتی! آخر مرویاتِ نبوی کا نام 'حدیث' کس نے رکھا اور کیوں رکھا؟ اس لیے ہم اس کا جواب بھی قرآن مجید ہی سے تلاش کرتے ہیں۔ ارشاد ہے:

''وَ اِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِیْثًا''[113] (یعنی: جب نبی نے اپنی کسی بیوی سے راز کی بات کہی،

یا ارشاد ہوتا ہے:

''وَلَا مُسْتَاْنِسِیْنَ لِحَدِیْثٍ''[114] یعنی: اے ایمان والو! نبی کے گھر کے اندر داخل ہوا کرو۔۔۔۔اور ان کی گفتگو سننے کے لیے وہاں اتنی دیر تک نہ بیٹھو کہ نبی کو تکلیف ہونے لگے۔

خیال فرمایا آپ نے حضور اکرم علیہ السلام کے اقوالِ مبارکہ کے لیے اللہ جل شانہ نے جو اصطلاح مقرر فرمائی وہ یہی 'حدیث' کا لفظ ہے اور عہدِ رسالت سے لے کر آج تک تمام مؤمنین اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی اصطلاح پر ایمان و عمل کی بنیاد قائم کیے ہوئے ہیں۔ اب کون ہے، جو اس حدیث کی اصطلاح کا منکر ہو!:

''فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا یَكَادُوْنَ یَفْقَهُوْنَ حَدِیْثًا''[115]۔ یعنی: کیا ہو گیا ہے اس قوم کو کہ حدیث کو نہیں سمجھتے۔

---

۱۱۳ التحریم ۶۶: (۳)۔

۱۱۴ الاحزاب ۳۳: (۵۳)۔

۱۱۵ النساء ۴: (۷۸)۔

اچھا: ''فَذَرۡنِیۡ وَ مَنۡ یُّکَذِّبُ بِھٰذَا الۡحَدِیۡثِ ؕ سَنَسۡتَدۡرِجُھُمۡ مِّنۡ حَیۡثُ لَا یَعۡلَمُوۡنَ''[۱۱۶] یعنی: آپ مجھ کو چھوڑ دیجیے اور جو شخص اس 'حدیث' کو جھٹلاتا ہے، اس کو بھی عنقریب ہم پستی میں لے جائیں گے کہ اس کو خبر نہ ہو گی۔

ابتدا میں یہ خیال بھی نہ تھا کہ زیبِ عنوان موضوع پھیل کر اتنا وسیع ہو جائے گا۔ دوسری مصروفیات کی وجہ سے وقت کی کمی کے علاوہ کتابیں بھی میسّر نہیں۔ جو کسی تحقیقی تحریر کے لیے اشد ضروری ہیں، ان نامساعد حالات میں مسلسل مضامین کا تصور مشکل بات تھی، مگر اللہ کا شکر ہے، جس کی توفیق واعانت سے اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لایا جاسکا، اگر ماحول سازگار ہوتا، تو ان مسائل کو ہم زیادہ تفصیل سے بیان کرتے، مگر مسموم ووبائی فضا کو فوراً علاج کی حاجت تھی، اس لیے تفصیلات سے قطعِ نظر کر کے محض اشاروں پر اکتفا کرنا پڑا۔

گزشتہ صفحات میں چند عنوانات اور ان کے ذیلی شعبوں سے بحث کی گئی ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ ایک غیر متعصب وناظر فدار آسانی سے منزلِ حق تک پہنچ سکتا ہے، ہاں جن کی آنکھوں پر عناد کی پٹی چڑھی ہوئی ہو اور رسول علیہ السلام کی معرفت سے محروم ہو کر عقل کی ساری صلاحیتیں کھو بیٹھے ہوں، ان کے لیے یہ حقائق کار آمد نہیں ہو سکتے، وہ تو روزِ روشن میں بھی دیکھنے سے عاری ہیں اور قرآن مجید کو حمائل کرنے کے بعد بھی اس کے اسرار وغوامض، تنویر و تجلّی سے نابلد ہی رہیں گے۔

۱۱۶۔ القلم ۶۸: (۴۴)۔

بابِ دوازدہم
"خلاصۂ مضمون"

۔۔بطور تتمہ مباحث کی فہرست،

۔ ۔کتاب وسُنّت کا باہم ربط،

۔۔ فہمِ قرآنی کے چند اہم اُصول،

۔۔ فہمِ قرآنی کے لیے حدیث کے انوار اور اُن کی اہمیت

یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن مجید حدیثوں کی مدد کے بغیر نہیں سمجھا جاسکتا اور حدیثوں کے نقد وانتخاب اور صحیح حدیثوں سے انتفاع واستفادہ کے لیے جن علوم کی ضرورت ہے، وہ لوگوں کو حاصل نہیں۔ اس کوتاہی کے مجرم علماء نہیں ہیں، وہ آج بھی اپنی زندگیاں اللہ ورسول کی راہ میں گزارنے کے لیے آمادہ ہیں۔ دین کی خدمت جو اگلوں نے کی تھی، اَخلاف کے دل بھی ان کی اُمنگوں سے خالی نہیں۔ مگر عوام اور حکومت کی نگاہ میں اِدھر کئی قرنوں سے علومِ دینیہ کی اہمیت کم ہوگئی ہے، اغیار کے تسلط اور مادیت کی چکا چوندھ نے ان کی فکر وعمل کا انداز یکسر بدل ڈالا۔ جب تک ہم دوبارہ اپنی گم شدہ راہ کا کھوج نہیں لگائیں گے، صراطِ مستقیم کی اُمید غلط ہے۔ ہم میں بیسیوں منکرِ حدیث، سینکڑوں منکرِ قرآن اور ہزاروں منکرِ خدا پیدا ہوتے رہیں گے۔ امامتِ عالم کی مستحق قوم، کمیونزم اور جمہوریتِ ناقصہ کے لیڈروں کی پیروی کرتے رہے گی۔

قرآن ایک زندہ کتاب ہے اور حدیثیں اس کی تابندہ تفسیر، خدا کے آخری رسول کی آخری تعلیم نہ مٹ سکتی ہے اور نہ بدل سکتی ہے، ہم میں اگر تبدیلی پیدا ہوئی ہے، تو اس سے ہم خسارے میں ہیں اللہ اور اس کے رسول کا نقصان نہیں ہے، قرآن مجید کی اصلیت محتاجِ دلیل نہیں اور حدیثوں کی صداقت چودھویں کے چاند سے زیادہ تابناک ہے، ہاں جو لوگ کال کوٹھریوں میں کواڑ بند کرکے بیٹھے ہوں، انھیں کیا خبر کہ ماہِ کامل نے کھلی فضا میں کیا نور برسائے! بدرِ تمام کی تابانی بحث ودلیل سے نہیں ثابت کی جاتی، یہ تو آنکھ والوں کا کام ہے کہ تنگ وتاریک مکان سے نکل کر جلوۂ جہاں تاب کا نظارہ کریں۔

گزشتہ صفحوں میں جن اُصول کو سامنے لایا گیا اور ان کی ذیلی شاخوں کی نشان دہی کی گئی، وہ حاشا وکلّا حجیتِ حدیث کی دلیلیں نہیں ہیں، رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات

وصفات کی طرح ان کی حدیثیں بھی ہماری زبان و قلم کی تائید سے مستغنی ہیں، بلکہ اس سلسلۂ مضامین کی اصل غرض ان پہلوؤں کو پیش کرنا تھا، جو ہمارے لیے قبولِ حدیث کی راہ میں شمعِ ہدایت ہیں اور ان غلط و جاہلانہ پروپیگنڈے کی تردید تھی، جن سے ناواقف عوام دھوکے کھا رہے ہیں۔ اگر ان گزشتہ صفحات کے مذکورہ مسائل پیش نظر ہوں اور جمع و تدوین، کتابت و اشاعتِ حدیث کا تاریخی پس منظر ذہن نشین رہے، تو کسی ابو جہل کی مجال نہیں ہے کہ اصحابِ بدر کے متبعین پر غلبہ حاصل کر سکے۔

حدیثوں کی تاریخی، لفظی، معنوی اور اسنادی حیثیتیں اتنی مکمل اور عینی ہیں کہ اسلام کا دعویدار ان پر ایمان لانے کا پابند ہے اور جو لوگ قرآن مجید کو ترجمے سے پڑھ کر اس کی من مانی شرح بیان کرتے ہیں، ان کی تجہیل کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ مختلف زبانوں کی نفسیات اور متکلم و مترجم کی نفسیات سے ناواقف ہیں۔

موضوع زیبِ عنوان کے تحت جو مختلف مسائل بیان کیے گئے اور ان سے حدیثوں کی اہمیت واضح کی گئی ہے، اپنی جگہ پر بہت کافی اور اطمینان بخش ہیں اور وہ مباحث حسب ذیل ہیں:

مبحث اوّل: زبان کی نفسیات، عربی زبان کی چند خصوصیتیں اور کثرتِ روایت کے اسباب۔

مبحث دوم: متکلم و مترجم اور اصل کلام و ترجمہ کا نفسیاتی فرق۔

مبحث سوم: جمعِ قرآن و جمعِ حدیث کے طریقے میں فرق اور اس کے وجوہ۔

مبحث چہارم: حدیثوں کی کتابت و اشاعت، عہدِ رسالت میں۔

مبحث پنجم: حجِ بیت اللہ اور روایتِ حدیث۔

مبحث ششم: صحابہ کا دور، روایتوں میں تسلسل اور حدیثوں کی اشاعت و کتابت۔

مبحث ہفتم: تدوینِ حدیث میں حکومتِ اسلامی کا تعاون۔

مبحث ہشتم: صحاح ستّہ سے پہلے کی کُتبِ روایت۔

مبحث نہم: نقد و انتخابِ روایت کے اصول اور اسنادِ حدیث کی تحقیق کے قواعد۔

مبحث دہم: متنِ حدیث سے استفادہ کا طریقہ۔

مبحث یازدہم: مقامِ رسالت اور حدیث کی اصطلاح۔

کتاب و سنّت کا باہم ربط

مذکورہ بالا مباحث تو حدیث و روایتِ حدیث سے متعلق ہیں، جن کی مدد سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ صحیح حدیثیں ہم تک پہنچی ہیں اور جس طرح ماضی کی کوئی بات نقل ہو کر مستقبل میں قابلِ یقین انداز میں پہنچ سکتی ہے، حدیثیں ان سے زیادہ باوثوق طور پر اور محفوظ طریقے پر منتقل ہوتی رہیں، بلکہ قرآن مجید کے ساتھ روایتوں کی وابستگی و پیوستگی نے احادیثِ رسول علیہ السلام کو قابلِ عمل و حجتِ دین بنائے رکھا۔ رہا یہ سوال کہ محفوظ قرآن ہوتے ہوئے صحیح اور محفوظ حدیثوں کی کوئی ضرورت بھی ہے؟ تو اس سلسلے میں چند اصولی باتیں عرض کی جاتی ہیں، جن کا تعلق دراصل فہمِ قرآن سے ہے اور اس وقت ہمارے اس مقالے کا موضوع نہیں، بلکہ یہ مسائل بطور خود مستقل عنوان ہیں جو ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ کبھی ''اصولِ فہم قرآن'' کے ضمن میں تفصیل سے بیان کیے جائیں گے۔ بہر کیف مثال کے طور پر انہی ''اصول فہم قرآن'' سے متعلق دو ایک ضروری اُمور پیش کیے جاتے ہیں، تاکہ قرآن و حدیث کا باہمی ربط آسانی سے سمجھ میں آجائے اور عامی و عالم کوئی بھی حدیثوں کی اہمیت اور ان کو دینی حجت تسلیم کرنے میں پس و پیش نہ کر سکے۔

فہم قرآن کے چند اصول

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن مجید اپنی تفصیلی ہدایتوں میں بھی صرف اُصولی وبنیادی قوانین عطا کرتا ہے، جن کی حیثیت دستوری اصطلاح میں 'ہدایتی اصول' کی ہے۔ وہ کسی حکم کے تمام شاخ درشاخ شعبوں کو بیان کرکے موافق ومخالف حکم نہیں دیتا ہے، کتاب اللہ کا دعویٰ کہ ''تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ'' و''فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا'' یہ ساری کی ساری باتیں اصول ومبانی سے متعلق ہیں اور بلاشبہ اصولی ہدایات کے لحاظ سے قرآن مجید واضح ترین اور بہت تفصیلی کتاب ہے۔ لیکن جہاں تک اُصولی احکام کی تعمیل کا تعلق ہے، ہمارے لیے حدیثوں کی رہنمائی سے مَفر نہیں۔ حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مقدس زندگی قرآن مجید کی ان معنوی تفصیلات کی جامع ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ پہلے قرآن مجید کے انداز بیان اور طرزِ ہدایت سے واقف ہوں اور اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل باتوں کو پیش نظر رکھیں:

اوّل: کلام اللہ کا ایک طرز رہنمائی یہ ہے کہ وہ احکام جو نفاذ وتعمیل کے لحاظ سے رواجی نوعیت کے ہیں، ان کی تفصیل نہیں بتاتا، بلکہ رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ترویج وتعامل پر چھوڑ دیتا ہے، مثلاً نماز کا بار بار حکم قرآن مجید میں مذکور ہے، اس کی تعمیل کے فائدے اور ترک کے نقصانات بتادیے گئے، یہاں تک کہ نمازوں میں کسل مندی سے بھی روکا گیا، مگر نماز کی تفصیل قرآن مجید میں واضح نہیں ہے، غور فرمایئے کہ اتنا اہم مسئلہ جس کی تکرار واعادہ سے قرآن بھرا پڑا ہے اور نفع ونقصان کے تمام پہلوؤں کی وضاحت ہے، لیکن خود نماز کے طریقۂ ادا اور طرزِ تعمیل کے بارے میں قرآن خاموش ہے، وجہ یہ ہے کہ نماز اپنی ساری اہمیتوں کے باوجود تعمیل ونفاذ کے اعتبار سے رواجی مسئلہ تھا اور حضور علیہ السلام

کی تعلیم اور صحابہ کے تعامل سے ہیئات نماز کی ساری تفصیلات مہیا کر دی تھیں۔ اگر یہ تفصیلات قرآن مجید میں موجود ہوتیں، تو بلاضرورت صرف ضخامتِ کتاب کا سبب بنتیں۔

لہٰذا نماز کی فرضیت، تعمیل کے فوائد اور ترک کے نقصانات تو قرآن مجید سے معلوم کرنا چاہییں، مگر نماز کی ترکیب و ہیئات کے لیے حدیثوں کے علاوہ کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے۔

دوم: قرآن مجید کا انداز رہنمائی کبھی یہ ہوتا ہے کہ پہلے جو باتیں عربوں مین رائج تھیں ان میں ناجائز پہلوؤں کو رد کر کے اچھی باتیں برقرار رکھتا ہے اور اگر کوئی نئی بات کا اضافہ مقصود ہو، تو ان ایک دو اُمور کو بیان کر دیتا ہے، مثلاً عرب جاہلیہ کے نکاح کے طریقوں میں سے مسئلۂ ولایت اور تراضیٔ طرفین کو برقرار رکھا اور دَینِ مہر کے وجوب کا اضافہ کر دیا، اگر یہ تفصیلات عرب جاہلی کے رواج میں ہم تلاش کریں، تو یقیناً یہ دینی حجت نہیں ہوں گے، لہٰذا ان کو فرامینِ نبوی علیہ السلام میں ڈھونڈھنا چاہیے۔

سوم: حج بھی ایک اسلامی فریضہ ہے، اللہ تعالیٰ نے حکم دے دیا، مگر اس فرض کی ادائیگی چونکہ جماعتی اور رواجی انداز میں ہوتی ہے، اس لیے حج کی تفصیلات کا بیان حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام پر چھوڑ دیا، جاہلی عرب کی ناپسندیدہ رسوم کی تردید کر دی۔ احرام سے متعلق چند ممانعتوں کا ذکر تو قرآن میں موجود ہے، مگر میقات، احرام، طریقۂ احرام اور مناسکِ حج کی تفصیل کے لیے نبوی تعلیم و تعامل یعنی حدیثوں کی امداد کے بغیر کوئی سبیل نہیں۔

چہارم: اسی طرح زکوٰۃ کا مسئلہ ہے جو تکرارِ حکم اور بار بار کی یاد دہانی کے لحاظ سے نماز کے ہم پلّہ ہے، مگر زکوٰۃ کی پوری تفصیلات قرآن میں نہیں ہیں، چونکہ یہ حکم بھی رواجی

اہمیت کا تھا اور مسلمانوں کی ایک جماعت اس فرض کی تعمیل پر قادر تھی، اس لیے مزید تفصیل کے لیے نبوی تعامل و تعلیم کی طرف رجوع ہونا چاہیے۔

پنجم: بعض اعمال ایسے ہیں، جن کی صحیح تعریف ہی میں تفصیلات شامل تھیں۔ قرآن ان کی تعریف کر دیتا ہے اور لوگوں کے دلوں سے وسوسہ و خطرات کو دور کرنے کے لیے منفی پہلو کی وضاحت کر دیتا ہے، مثلاً روزہ اس حکم کے لیے زیادہ تفصیل کی ضرورت نہ تھی، صرف اس عبادت کی تعریف کر دی گئی اور حدود و قیود بیان کر دیے گئے، روزے کی تفصیلات مہیا ہو گئیں اور اس کٹھن عبادت کی وجہ بیان کر کے روزے کی اہمیت ذہن نشین کر دی گئی۔

ششم: کبھی قرآن مجید بعض احکام میں قدیم شرائع کو برقرار رکھتا ہے اور جو کمی ان کے اندر تھی، اس کی اصلاح کر دیتا ہے۔ مثلاً حرام و حلال جانوروں کی شناخت یہ مسئلہ ذرا تفصیل طلب ہے، اس لیے تھوڑی سی وضاحت موقع کے مناسب ہو گی۔ یہ ذہن نشین رہے کہ جن مسائل میں قرآن مجید کچھ تفصیلی جزئیات بیان کرتا ہے، ان کی حیثیت چوراہے کے نشان کی ہے، منزلِ مقصود اور اس نشان کے درمیان جو راستے کے اُتار چڑھاؤ ہوتے ہیں ان کی واقفیت حدیثوں سے ہو سکتی ہے، گویا وہ جزئیات بھی نقطے ہیں، جن کو کسی ماہرِ نقاش کی رہنمائی میں صحیح خطوط کے ذریعے ملا کر مکمل کیا جا سکتا ہے، ورنہ ایک نو آموز یا ناآموز اپنی نادانی سے الٹی سیدھی لکیریں، ڈال کر حقیقت کو کچھ سے کچھ بنا دے گا۔ اسی حلال و حرام جانور کے مسئلے کو لے لیجئے۔ قرآن مجید نے کافی تفصیلات بیان کی ہیں، مگر ان کو صحیح طرح جاننے کے لیے بہر حال حدیثوں کی ضرورت ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ یَّكُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ"[۱۱۷]

یعنی: "اے رسول! کہہ دیجئے کہ جو میرے پاس حرام کھانوں کے متعلق وحی آئی ہے، ان میں صرف مُردار یا بہتا خون یا سور کا گوشت یا غیر اللہ کے نام کا ذبیحہ حرام ہیں"۔

اس آیت سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بس یہی چار چیزیں حرام ہیں، لیکن جب ہم قرآن مجید پر غور کرتے ہیں، تو ان ممنوعات کی مزید تفصیل ملتی ہے اور یہاں جو میتہ یعنی مُردار کے لفظ سے صرف ایک قسم کا جانور حرام تھا اور ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ مُردار وہ جانور ہے جو طبعی موت مرے، دوسری جگہ پانچ قسم کے اور جانوروں کو مردار کے حکم میں داخل کر دیا گیا، ارشاد ہے:

"حُرِّمَتْ عَلَیْكُمُ الْمَیْتَةُ وَ الدَّمُ وَ لَحْمُ الْخِنْزِیْرِ وَ مَآ اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَ الْمُنْخَنِقَةُ وَ الْمَوْقُوْذَةُ وَ الْمُتَرَدِّیَةُ وَ النَّطِیْحَةُ وَ مَآ اَكَلَ السَّبُعُ"[۱۱۸]۔

یعنی: پہلی مذکورہ چار چیزوں کے علاوہ یہ جانور بھی مُردار ہی کے حکم میں ہیں:

۱۔ وہ جانور جن کا دم گھٹ کر نکلا ہو۔

۲۔ ضرب شدید مثلاً ڈنڈے کی مار سے مرنے والے جانور۔

۳۔ نیچے گر کر مرنے والے جانور۔

۴۔ سینگ کی مار سے مرنے والے جانور۔

۱۱۷؎ الانعام ۶: (۱۴۵)۔

۱۱۸؎ المائدة ۵: (۳)۔

۵۔ درندے نے جن کو پھاڑ ڈالا ہو، غرض یہ پانچ چیزیں بھی میتہ یعنی مُردار میں شمار ہوں گی۔

پہلی آیت کی رو سے حرام جانوروں میں "مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ" تھا، یعنی جو جانور غیر اللہ کے نام پر ذبح ہوا ہو، لیکن دوسری آیت میں تفصیل بیان کرتے ہوئے قرآن نے بتایا کہ وہ جانور جو بتوں کے استھانوں پر ذبح ہوں[119] وہ بھی "مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ" میں داخل ہیں، غرض یہ فہرست حرام کھانوں کی تھی۔ کیا ان کے علاوہ تمام جانور حلال ہیں؟ تو قرآن مجید ہدایت کرتا ہے کہ

"لَا تَأْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ"[120] یعنی: "جس جانور کے ذبح کے وقت اللہ کا نام نہ لیا جائے اسے نہ کھاؤ"۔

پہلی آیت میں غیر اللہ کے نام کا ذبیحہ حرام تھا اور دوسری آیت میں ان ذبائح کو بھی حرام کر دیا گیا، جن کے ذبح کے وقت اللہ کا نام نہیں لیا گیا۔ حرام جانوروں کی تفصیل کے علاوہ حلال جانوروں کے متعلق بھی قرآن مجید نے اجمالی ہدایت دے دی اور فرمایا کہ

"طَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ"[121] یعنی: "اہلِ کتاب کے حلال کھانے تمھارے لیے بھی حلال ہیں"۔

---

۱۱۹ ملاحظہ ہو: المائدہ۵: (۳): ﴿وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ﴾۔

۱۲۰ الانعام۶: (۱۲۱)۔

۱۲۱ المائدۃ۵: (۵)۔

اہلِ کتاب کے نزدیک کیا چیزیں حلال تھیں، ہمیں نہیں معلوم پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا اہلِ کتاب کے لیے مذکورہ حرام جانوروں کے سوا تمام چوپائے اور پرندے حلال تھے یا موسوی وعیسوی شریعت میں ان کی کوئی فہرست بھی درج ہے اور اس مسئلہ میں مقررہ اصول و قواعد بھی ہیں؟ مسلمانوں کے لیے اہلِ کتاب کے اس خاص مسئلے کا جاننا اس لیے ضروری ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمارے حق میں انھیں جانوروں کو حلال ٹھہرایا، جو اہلِ کتاب کے لیے حلال تھے۔

اس بارے میں قرآن مجید کی دوسری آیت اشارہ کرتی ہے کہ تمام چرند پرند اہلِ کتاب کے لیے حلال نہیں تھے، بلکہ ان کی ایک معین فہرست ہے۔ ہمیں بھی اس خاص فہرست کے مطابق عمل کرنا چاہیے۔ ارشاد ہے:

''كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيٓ اِسۡرَآءِيۡلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسۡرَآءِيۡلُ عَلٰى نَفۡسِهٖ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تُنَزَّلَ التَّوۡرٰىةُ''[122]

یعنی: ''مخصوص قسم کے تمام کھانے بنی اسرائیل کے لیے حلال تھے، بجزان چیزوں کے جو اسرائیل یعنی: یعقوب علیہ السلام نے نزولِ توریت سے پیشتر بطور خود اپنے پر حرام کرر کھا تھا''۔

یہاں دو باتیں یاد رکھیے کہ قرآن مجید میں 'طعام' کا لفظ آیا ہے، لیکن مراد حلال وحرام جانور ہیں، کیونکہ حلال وحرام کا فرق جاندار غذاؤں میں ہے، پھلوں اور غلوں میں حلال وحرام کا تعلق براہِ راست نہیں ہے۔ دوسری اہم بات اس آیت میں یہ ہے کہ 'طعام' پر الف لام داخل ہے، عربی اصول کے مطابق کھانوں کی ایک خاص قسم اور خاص فہرست مراد ہوگی۔

---

[122] آلِ عمران ۳: (۹۳)۔

قرآن مجید کے اس عام حکم کے بعد سارے مسلمان اہلِ کتاب کے کہنے کے مطابق ان سے حلال جانوروں کی فہرست لے کر اور اسی کی رہنمائی میں حلال و حرام میں تمیز کر لیتے۔ مگر اس فہرست میں بعض چیزیں ایسی داخل تھیں، جو اللہ کی طرف سے حرام نہ تھیں، مثلاً اونٹ کا گوشت اور بعض چیزیں تادیبی لحاظ سے بنی اسرائیل کے حق میں حرام تھیں، اگرچہ اپنی فطرت کے اعتبار سے خبائث میں داخل نہیں ہیں اور مسلمانوں کے حق میں ان کو حلال رہنا چاہیے، تیسری قسم کی وہ چیزیں تھیں، جو اپنی فطرت کے لحاظ سے خبائث میں شمار ہوتی تھیں اور شریعتِ ماقبل میں حلال نہیں تھیں، لیکن نصاریٰ نے اپنی خود رائی سے حلال بنالیا تھا۔

اس لیے اہلِ کتاب کے حلال جانوروں کی فہرست کی طرف ہمیں متوجہ کرنے کے بعد اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان سہ گانہ جزئیات کی تفصیل بیان کی اور تمام ناپاکیوں اور خرابیوں کی اصلاح کر دی۔ چنانچہ حلال جانوروں کی فہرست سے یعقوب علیہ السلام نے اپنے لیے بطورِ نذر اُونٹ کو علیحدہ کر دیا تھا۔ حلال جانوروں کی چربی شریعت موسوی میں تادیباً حرام تھی، اللہ تعالیٰ نے تصریح کرکے حلال فرمادیا، ارشاد ہوتا ہے کہ

”وَ مِنَ الْبَقَرِ وَ الْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ“[123] یعنی: ”گائے بکری کی چربی ان یہودیوں پر ہم نے حرام کر رکھی تھی“۔

اب یہ حکم اپنی اصلی حالت پر آگیا ہے اور وقتی حرمت دور کر دی گئی۔ نصاریٰ نے اپنی طرف سے حلال جانوروں کی فہرست میں خنزیر[124] کو داخل کر دیا، مگر چونکہ قرآنی فہرست میں یہ خبائث میں داخل ہے، اس لیے حرام رہے گا۔

۱۲۳؎ الانعام ۶: (۱۴۶)۔

ان مستثنیات اور جزئی اصلاحات کے ساتھ اس پوری فہرست کو اپنے لیے اختیار کر لو، جو اہلِ کتاب کو حلال جانوروں کے سلسلہ میں دی گئی تھی۔ اب ہمارے لیے دو ہی صورتیں ہیں یا تو توریت کو اُٹھائیں اور حلال و حرام جانوروں کے سلسلے میں جو ضابطے اور فہرست وہاں درج ہیں، قبول کر لیں۔ لیکن توریت محرف ہے: "یُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ[125]" اہلِ ایقان مسلمانوں کو محرف و غیر معتمد توریت سے کیونکر طمانیت حاصل ہو سکتی ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ہم رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف رجوع ہو کر "اَلطَّعَامُ" کی قابلِ وثوق فہرست حضور سے طلب کریں اور حدیثوں میں جو حلال و حرام جانوروں کا فرق بتایا گیا ہے، بہ دل و جان تسلیم کریں۔ توریت محرف ہو چکی تھی اور حضور "اَلطَّعَام" کی فہرست بغیر کسی قدیم سند کے پیش فرما رہے تھے، اس لیے اللہ جل شانہ نے صراحت کر دی کہ

"وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ"[126] یعنی: "حضور مؤمنین کے لیے پاکیزہ چیزیں حلال فرماتے ہیں اور خبیث اور گندی چیزیں حرام فرماتے ہیں"۔

=

۱۲۴؎ چنانچہ اسی کتاب مقدس کے استثنا، باب ۱۴: آیت: ۸ میں ہے: "اور سُؤر تمہارے لئے اس سبب سے ناپاک ہے کہ اُس کے پاؤں تو چِرے ہوئے ہیں پر وہ جگالی نہیں کرتا۔ تُم نہ تو اُن کا گوشت کھانا اور نہ اُن کی لاش کو ہاتھ لگانا"۔

۱۲۵؎ النساء ۴: (۴۶)۔

۱۲۶؎ الاعراف ۷: (۱۵۷)۔

یہ آیت صرف اس لیے نازل ہوئی تاکہ کوئی منکرِ حدیث کبھی بھی حلال وحرام سے متعلق حضور علیہ السلام کی دی ہوئی طویل فہرست قبول کرنے میں چون وچرا نہ کرے۔

اگر یہ آیت نہ بھی نازل ہوتی، پھر بھی محرف توریت کے مقابلے میں صحیح حدیثوں کی تفصیل تو بہر حال زیادہ معتبر ہے۔

حلال وحرام جانوروں کی تفصیل سے یہ معلوم ہو گیا کہ قرآن مجید نے اگرچہ اس خاص مسئلے کی چند جزئیات بیان کی ہیں، مگر ان کی حیثیت بھی صرف ضمنی اصلاحات اور اصولوں کی و لفظوں کی ہے، ورنہ ہمیں اس بارے میں یا تو اہلِ کتاب کی فہرست ''الطعام'' کو سامنے رکھنا چاہیے یا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں پر عمل کرنا چاہیے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ گذشتہ شریعت کا کوئی کلیہ جو اسلام میں بھی معتبر اور واجبُ التعمیل ہے، مگر احبارِ یہود نے تحریف کر کے اس کلیے کو بدل دیا ہے۔ قرآن مجید اس کلیہ کا اعادہ کر دیتا ہے تاکہ اُمتِ مسلمہ کو صحیح ہدایت حاصل رہے۔ مثلاً اسی طعام اہلِ کتاب کو لیجیے۔ تمام چرند وپرند جانوروں میں پنجے والے پرند، درندے اور حیوان شریعتِ موسوی میں حرام تھے، لیکن موجودہ توریت میں یہ کلیہ پرندوں کے حق میں تو موجود ہے، مگر چوپایوں کے حق میں صورت بدلی ہوئی ہے، جس کے نتیجے میں اُونٹ حرام جانوروں میں داخل ہو جاتا ہے[127]، اللہ جل شانہٗ نے اس غلطی کی اصلاح کر دی ارشاد ہوتا ہے:

---

[127] ''(۳) جانوروں میں جن کے پاؤں الگ اور چرے ہوئے ہیں اور وہ جُگالی کرتے ہیں تُم اُن کو کھاؤ۔ (۴) مگر جو جُگالی کرتے ہیں یا جن کے پاؤں الگ ہیں اُن میں سے تُم اِن جانوروں کو نہ کھانا یعنی اُونٹ کو =

"وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٍ"[۱۲۸] یعنی: "ہم نے یہود پر چنگل والے جانوروں کو حرام کر دیا تھا"۔

لہٰذا "الطعام" کی فہرست سے پنجوں والے جانور چرند و پرند نکل گئے اور یہی حضور علیہ السلام کی حدیثوں میں بھی موجود ہے۔

کبھی قرآن مجید کسی مسئلے کے صرف زیرین پہلو کو بیان کر کے اِیجابی یا سلبی حکم دیتا ہے اور اس مسئلے کے بالائی مراتب منطقی طور پر اس حکم میں داخل ہو جاتے ہیں۔ احادیث نبوی اس حکم کے مختلف مدارج کی تفصیل بیان کرتی ہے۔ مثلاً والدین کے احترام کے سلسلہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ

"لَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا"[۱۲۹] یعنی ماں باپ کو نہ جھڑکو اور نہ ان کے سلوک پر اُف کہو۔

=

کیونکہ وہ جُگالی کرتا ہے پر اُس کے پاؤں الگ نہیں۔ سو وہ تُمہارے لئے ناپاک ہے"۔ (کتابِ مقدس' احبار، باب ۱۱: آیت: ۳۔۴)۔

"(۶) اَور چَوپایوں میں سے جِس جِس کے پاؤں الگ اور چِرے ہُوئے ہیں اور وہ جُگالی بھی کرتا ہو تُم اُسے کھا سکتے ہو۔ (۷) لیکن اُن میں سے جو جُگالی کرتے ہیں یا اُن کے پاؤں چِرے ہُوئے ہیں تُم اُن کو یعنی اُونٹ اور خرگوش اور سافان کو نہ کھانا کیونکہ یہ جُگالی کرتے ہیں لیکن اِن کے پاؤں چِرے ہُوئے نہیں ہیں سو یہ تُمہارے لئے ناپاک ہیں"۔ (کتابِ مقدس'، استثنا، باب ۱۴: آیت: ۶۔۷)۔

۱۲۸؎ الانعام ۶: (۱۴۶)۔

۱۲۹؎ الاسراء ۱۷: (۲۳)۔

احترامِ والدین کا یہ سب سے ادنیٰ پہلو تھا، ان کے ساتھ بد سلوکی، سختی، مار پیٹ، ان سے خدمت لینا وغیرہ یہ تمام باتیں اور خود اُف اُف اور نَہر کے اندر داخل ہو گئیں احادیثِ نبویہ ﷺ ان نازک مسائل میں ہماری تفصیلی رہنمائی کرتی ہیں۔

غرض قرآن مجید اُصولی ہدایات دیتا ہے اور اس کی تفصیلات بھی محض ضمنی اور استثنائی حیثیت رکھتی ہیں ورنہ کسی حکمِ قرآنی کے تمام پہلوؤں کو جاننے کے لیے حدیثوں کے بغیر چارہ، بلکہ اگر حدیثوں سے مدد نہ لی جائے، تو اعتقادی اُمور کے سوا تمام عملی احکام معطل ہو جائیں گے اور قرآن مجید کی کسی ہدایت پر عمل نہیں ہو سکے گا۔ اس طرح جو مذہب اپنے دعوے اور حقیقت کے لحاظ سے انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے اور دین و دنیا اس ہدایت کے حدود کے اندر ہیں، نا قابلِ عمل ہو کر محض بحث و مباحثہ کا مذہب رہ جائے گا۔ قرآن کو سمجھنے کے لیے حدیثوں سے ہم مستغنی نہیں ہو سکتے۔

وَمَا عَلَيْنَآ اِلاَّ الْبَلَاغ

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَّ عَلىٰ آلِهِ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ

ختم شد

۞.....۞.....۞.....۞

﴿فہرست کتابیات﴾

القرآن الکریم
۱۔ الإلماع إلیٰ معرفۃ أصول الروایۃ وتقیید السماع، ابو الفضل عیاض بن موسیٰ بستی، دار التراث قاہرہ، طبعہ اولیٰ ۱۹۷۰ء۔
۲۔ انوارِ حدیث، سید محمد ہاشم فاضل شمسی، ورلڈ فیڈریشن آف اسلامک مشنز، کراچی ۱۹۸۵ء
۳۔ انوارِ علمائے اہلسنت سندھ، سید محمد زین العابدین راشدی، کراچی۔
۴۔ انوار الفرقان، علامہ عبدالحکیم شرف قادری رحمۃ اللہ علیہ۔
۵۔ بریقہ محمودیہ شرح طریقہ محمدیہ، ابو سعید محمد بن محمد خادمی، مطبعہ حلبی، ۱۳۴۸۔
۶۔ تاریخ دمشق، امام ابو القاسم علی بن حسین معروف بہ ابن عساکر، دار الفکر بیروت، ۱۹۹۵ء
۷۔ جامع بیان العلم وفضلہ، امام ابو عمر یوسف بن عبد اللہ بن محمد بن عبد البر نمری، دار ابن الجوزی، سعودیہ، طبعہ اولیٰ ۱۹۹۴ء۔
۸۔ الجامع لأخلاق الراوی وآداب السامع، امام ابو بکر احمد بن علی خطیب بغدادی، مکتبۃ المعارف، ریاض، سعودیہ۔
۹۔ دہریت اور اس کی ایڈیالوجی، سید محمد ہاشم فاضل شمسی (سن)
۱۰۔ سنت خیر الانام، پیر محمد کرم شاہ ازہری، ضیاء القرآن پبلی کیشنز کراچی ۲۰۰۳ء۔
۱۱۔ سنن ابن ماجہ، امام ابو عبد اللہ بن م حمد بن یزید قزوینی، دار احیاء الکتب العربیہ۔
۱۲۔ سنن ابی داود، امام ابو داود سلیمان بن اشعث سجستانی، مکتبہ عصریہ صیدا، بیروت۔
۱۳۔ سنن الترمذی، امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی، مطبعہ مصطفیٰ البابی، مصر، طبعہ ثانیہ ۱۹۷۵ء

۱۴۔ سنن الدارمی، امام ابو محمد عبد اللہ بن عبد الرحمن دارمی سمرقندی، دار المغنی، سعودیہ عربیہ، طبعہ اولیٰ ۲۰۰۰ء

۱۵۔ السنن الکبریٰ، امام ابو بکر احمد بن حسین بیہقی، دار الکتب العلمیہ بیروت، طبعہ ثالثہ ۲۰۰۳ء

۱۶۔ سیرت سید الانبیاء ﷺ (اردو ترجمہ: بذل القوۃ فی حوادث سنی النبوۃ، از علامہ محمد ہاشم ٹھٹوی)، مترجم: مفتی محمد علیم الدین نقشبندی، مظہرِ علم، شاہدرہ لاہور، طبع دوم مارچ ۲۰۰۳ء۔

۱۷۔ شرح مشکل الآثار، امام ابو جعفر احمد بن محمد ارزی طحاوی، مؤسسۃ الرسالہ، طبعہ اولیٰ ۱۴۱۵ھ۔

۱۸۔ صحیح البخاری، امام ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل بخاری، دار طوق النجاۃ، طبعہ اولیٰ ۱۴۲۲ھ۔

۱۹۔ صحیح مسلم، امام ابو الحسن مسلم بن حجاج قشیری نیشاپوری، دار احیاء التراث العربی، بیروت۔

۲۰۔ الطبقات الکبریٰ، امام ابو عبد اللہ محمد بن سعد بغدادی، مکتبۃ العلوم والحکم، مدینہ منورہ، طبعہ ثانیہ، ۱۴۰۸ھ۔

۲۱۔ عظمتوں کے پاسباں، علامہ عبد الحکیم شرف قادری، الممتاز پبلی کیشنز، لاہور، بار اول ۲۰۰۰ء

۲۲۔ کتابِ مقدس، (The Holy Bible, KJV)

۲۳۔ کوثر النبی وزلال حوضہ الروی، علامہ عبد العزیز بن احمد ملتانی، مخطوط۔

۲۴۔ لغات القرآن، غلام احمد پرویز، طلوع اسلام ٹرسٹ، لاہور، چوتھا ایڈیشن ۱۹۹۸ء۔

۲۵۔ ماہنامہ صوفی، دہلی جون ۱۹۲۱ء۔

۲۶۔ المحدث الفاصل بین الراوی والواعی، ابو محمد حسن بن عبد الرحمن رامہرمزی فارسی، دار الفکر بیروت، طبعہ ثالثہ، ۱۴۰۴ھ

۲۷۔ مسند احمد، امام ابو عبد اللہ احمد بن حنبل شیبانی، مؤسسۃ الرسالہ، طبعہ اولیٰ ۲۰۰۱ء

۲۸۔ مسند البزار، امام ابو بکر احمد بن عمرو البزار، مکتبۃ العلوم والحکم، مدینہ منورہ، طبعہ اولیٰ ۲۰۰۹ء

۲۹۔ مقامِ حدیث، طلوع اسلام ٹرسٹ، لاہور، چھٹا ایڈیشن ۲۰۰۱ء۔

۳۰۔ المواہب اللدنیۃ بالمنح المحمدیہ، ابو العباس احمد بن محمد قسطلانی، مکتبہ توفیقیہ، قاہرہ۔

۳۱۔ الموطأ، امام مالک بن انس مدنی، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۹۸۵ء۔

۳۲۔ ناسخ الحدیث ومنسوخہ: امام ابو حفص عمر بن احمد معروف بہ ابن شاہین بغدادی، مکتبۃ المنار، طبعہ اولیٰ ۱۹۸۸ء

۳۳۔ الوسیط فی علوم ومصطلح الحدیث، ابو شہبہ محمد بن محمد بن سویلم، دار الفکر العربی۔